محشرستانِ فلسطین

(نوشتہ ۱۹۶۷ء)

پس منظر

(اسرائیلی حکومت مئی ۱۹۴۸ء میں وجود میں آئی تھی اور ہم نے جون ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا جس میں اس کش مکش کے پس منظر کو پوری صراحت کے ساتھ واضح کیا تھا۔ حالات آگے بڑھتے گئے تو ہم نے اپنی اشاعت بابت فروری ۱۹۶۷ء میں اسے دھرایا۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس المیہ جانگداز و جگرسوز کے متعلق لکھتے رہے۔ اب جو اس مسئلہ نے خاص اہمیت حاصل کی ہے تو ہم سے کہا جا رہا ہے کہ اس قضیۂ ماضی کو سامنے لایا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس مفسدہ انگیزی اور خونریزی کی اصل کیا ہے۔ اس بناء پر ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کی ابتدا اس تشریحی مقالہ سے کی جائے جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا اور جو بڑا معلومات افزا تھا۔ اس ماضی کی داستان سے حال کی حشر انگیزی کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی)۔

(٥)

اہلِ فلسطین، خواہ وہ کسی نسل سے متعلق کیوں نہ رہے ہوں، آغازِ تاریخ سے ہی جنگوں سے دوچار رہے ہیں۔ انسانی تاریخ کوئی زیادہ طویل نہیں، بمشکل چھ سات ہزار سال کا ریکارڈ موجود ہوگا۔ تاریخ کی روشنی وقت کے اندھیرے کو اور روشن کر سکے تو فلسطین جنگ و پیکار میں ہی الجھا دکھائی دے گا۔ جغرافیہ نے اس ملک کو، کہ جس کا رقبہ بمشکل پنجاب کے چار اور سندھ کے دو اضلاع کے برابر ہوگا، کچھ ایسا مقام بخشا ہے کہ یہ حقیر سا ملک کبھی امن و اطمینان سے نہ رہ سکا۔ نقشۂ عالم پر نگاہ ڈالنے سے یہ دوشن ہو جائے گا کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

بین الاقوامی جنگاہ

منضبط تاریخ کے آغاز سے ہی فلسطین معلوم دنیا کا مرکز تھا۔ اس کے مشرق میں ایشیا تھا، مغرب میں یورپ، شمال میں پھر یورپ اور ایشیا، جنوب میں افریقہ۔ یہ ساری کی ساری معلوم دنیا تھی۔ امریکہ، آسٹریلیا اور شمالی ساحل کے علاوہ سارا

افریقہ غیر مساحت شدہ اور غیر معلوم تھا۔ شمالی اور جنوبی امریکاؤں اور آسٹریلیا ایسے وسیع و عریض ارضی حصص کی موجودگی کا گمان تک بھی نہ تھا۔ نقشہ پر یورپ تھا، اور وہ بھی جنوبی اور مشرقی، شمالی افریقہ مشمولہ مصر اور ایشیا۔ اس معلوم دنیا کے عین وسط میں ایک معمولی حصۂ زمین، انگلستان کے علاقہ ویلز کے برابر فلسطین۔ معلوم دنیا میں قومیں اُبھرتی اور مٹتی رہیں۔ چین، وادیٔ سندھ، اسیریا، بابل، مصر، فارس، یونان، روما! ان اقوام کے عروج و زوال کے لئے باہمی تصادم ناگزیر تھا۔ ان بین الاقوامی معرکوں کے طوفان اس حقیر سے زمینی ٹکڑے کو بے دردی سے روندڈالتے رہے۔ اس کے حسیات و مطالبات دھرے کے دھرے رہ جاتے اور اس کے باشندے کچل دئیے جاتے فلسطین کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہا کہ وہ اِس کا حلیف ہو یا اُس کا حریف، وہ کس کی مدد کرے اور کس سے استمداد۔ اس کا فیصلہ اور انتخاب کچھ بھی ہو، نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

امن کے زمانہ میں فلسطین، بین الاقوامی، تجارتی قافلوں کی گزرگاہ تھا۔ اور جنگ کے زمانہ میں عساکر و جیوش کی آماجگاہ۔ فلسطین بری اور بحری شاہراہوں پر تھا۔ یورپ۔ ایشیا اور افریقہ فلسطین کے ذریعہ باہمی تجارت کرتے تھے۔ امن کی حالت میں فلسطین فارغ البال رہتا اور جنگ کے دوران میں وہ تباہ ہو جاتا۔ اس کی قومی آزادی و خود مختاری ناقابلِ حصول ہی رہی۔ ایسے مواقع پر کہ متحارب فریق برابر قوت کے مالک ہوتے تھے فلسطین کسی ایک طرف ہو کر پانسہ پلٹ دیتا تھا۔ اس وقت اہلِ فلسطین کی حقیر امداد بھی متعلقہ فریق کا پلڑا بھاری کر دیتی۔ لیکن یہ اہمیت خطرناک تھی۔ وہ حریف یا حلیف بن کر آسان جنگگاہ بن جاتا رہا۔

آلِ اسرائیل

حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل (مردِ خدا) تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی، اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (JUDA) تھا۔ یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ فلسطین کے علاقہ موسومہ (JUDA) میں سلطنت کرتا تھا۔ اسی نسبت سے انہیں یہودی کہا جانے لگا اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل.... آہستہ آہستہ یہ تفریق بھی جاتی رہی۔ چنانچہ اب بنی اسرائیل اور یہودی کا ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے اپنے والد بزرگوار اور تمام قبیلہ کو مصر بلا لیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کی وجہ سے ان کی مصر میں بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے۔ یہیں بڑھے، پھولے، پھلے۔ جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا، اس عرصہ میں عظیم الشان قوم بن گیا۔ فرعونِ مصر ان کی بڑھتی ہوئی قوت و کثرت سے خائف ہوا کہ مبادا وہ اس کے دشمنوں سے مل کر کوئی سازش برپا کر دیں۔ اس لئے اس نے انہیں کچلنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ یہ حکم دے دیا گیا کہ "بنی اسرائیل کی قوت کی روک تھام کے لئے ان کے بیٹوں کو ہلاک کر دیا جائے اور بیٹیاں زندہ رہنے دی جائیں"۔ یعنی ان میں سے ایسے لوگوں کو جن میں جوہرِ مردانگی کی نمود ہو، کچل دیا

جائے، اور زنانہ صفت لوگوں کو آگے بڑھایا جائے۔

حضرت موسیٰؑ، کہ آلِ اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبر ہیں، اسی عالم میں مصر کے دارالسلطنت میں پیدا ہوئے۔ مشیّت ایزدی نے آلِ اسرائیل کے اس فرزند کی پرورش کا سامان شاہی محلات میں کر دیا اور اس کے بعد طور کی وادیوں میں آزاد تربیت کا انتظام۔ وہاں سے لوٹے، کر انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دی جائے۔ یہودیوں کی اپنی روایات (عہد نامہ عتیق) کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے بعد یوشوا کی قیادت میں بنی اسرائیل نے فلسطین کو بزورِ شمشیر فتح کیا اور قدیم باشندوں کو ملک بدر کر دیا یا ان کا خاتمہ کر دیا۔ جدید مؤرخین اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ قدیم باشندے بالکلیہ نیست و نابود ہو گئے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کبھی بھی مکمل طور پر فتح نہیں ہو سکے۔ بلکہ مفتوحہ علاقہ میں آباد رہے اور بنی اسرائیل سے ازدواجی تعلقات قائم کر لئے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی کتاب (THE OUTLINE OF HISTORY) میں لکھا ہے:-

> یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موعودہ سرزمین (THE PROMISED LAND) کبھی بھی مکمل طور پر عبرانیوں کے قبضہ میں رہی ہے۔ انجیل کی متفرق کتابوں میں باختلافِ واقعات تاریخ کو دہرایا گیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ (PHILISTINES) جنوب کی زرخیز زمین پر قابض رہے اور شمال میں کنعانی اور فونیشین اسرائیلیوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

اسرائیلی، شبانی اور زرعی زندگی کے عادی تھے، مگر ان میں سپاہی بھی تھے۔ مفتوح (یا ہنوز غیر مفتوح) پر رحم کرنا، ان کے نزدیک یہودہ کے خلاف گناہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے پیشرو مالکانِ زمین کو ختم نہ کر دینا ادائے فرض میں ناکامی کے مرادف سمجھتے تھے۔ یہودیوں کی موجودہ خصائل ـــــ شہروں میں بسنا، مالیات و تجارت میں مہارت وغیرہ ـــــ ان کے اسرائیلی اسلاف کی خصائل ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی خونریزی کی تفسیر ہے۔ بعد میں وہ کاشتکار اور زراعت پیشہ رہے نہ کہ مدنی۔ حمار۔ حضرت سلیمانؑ کے تزک و احتشام کے باوجود عہد نامۂ عتیق کی داستان، مکانات اور محلّات کے بجائے گیہوں، انگور، زیتون، بھیڑوں اور بیلوں کی داستان ہے۔ خدا کے لئے ان کے ہاں عزیز ترین نام "شبان" (گڈریا) ہے۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ، آلِ اسرائیل کے جلیل القدر بادشاہ تھے اور پیغمبر بھی۔ حضرت داؤدؑ نے پہلی بار گیارھویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اور حضرت سلیمانؑ نے دسویں صدی میں بیت القدس کے پہلے ہیکل کی تعمیر کرائی۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کے اوجِ کمال کا زمانہ تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ان کی شوکت و ثروت انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد انحطاط کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد بارہ اسرائیلی قبائل میں سے دس نے فلسطین کے شمالی حصّہ میں "سلطنتِ اسرائیل" کو قائم کیا۔ باقی دو یعنی جودہ اور بن یامین کے قبائل بدستور

جنوب میں تختِ داؤد کے وفادار رہے۔

تباہی کی داستان

یوں تو یہود کی تباہی کی داستان کی ہر کڑی عبرت انگیز ہے لیکن ان پر دو مرتبہ ایسی ہلاکت آفریں بربادی کی لعنت طاری ہوئی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے قبل نہ دیکھی تھی۔ قرآن نے ان ہر دو مواقع کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہر بربادی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی، بلا جرم سزا نہیں تھی۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ (۱۷/۴)

اور (دیکھو) ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دے دی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے۔"

تورات میں بھی بنی اسرائیل کی ان دو بڑی تباہیوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ کوئی ۷۲۱ء ق۔م میں شمالی فلسطینی حکومت پر اشوریوں نے قبضہ کر لیا تھا اور باشندوں کو قید کر کے لے گئے تھے۔ تاریخ ان کے انجام کے معمّہ کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ اس حادثہ کے کوئی ایک سو سال بعد بابل کے شاہ بخت نصر نے "جنوبی حکومت" کو تہ و بالا کر دیا۔ یروشلم کی، کہ یہودیوں کا دینی اور سیاسی مرکز تھا، اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ قتل و غارت گری سلب و نہب کا ایسا جاں گداز مرقع تھا جو تاریخِ عالم میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف بنی اسرائیل کی سلطنت تباہ ہوئی، بلکہ ان کی قومیت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی اور غلامی و محکومی، ہلاکت و بربادی کی بڑی سے بڑی مصیبتیں جو کسی قوم پر آسکتی ہیں سب یکجا ہو گئیں۔ بخت نصر نے یروشلم کو لوٹا، جلایا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ سانحہ ایسا المناک اور دل سوز تھا کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں یہودیوں کے انبیاءؑ ان کی اس زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ اسارت کا یہ زمانہ شاہِ فارس کے ہاتھوں ختم ہوا، جب ساٹھ سال کے بعد سائرس نے دریائے فرات اور بحرِ روم کا درمیانی علاقہ فتح کر لیا اور یہودیوں کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دے دی۔ شاہانِ فارس نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی از سرِ نو تعمیر کی بھی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵۳۷ سے ۵۱۵ ق۔م کے دوران ہیکل پھر تعمیر ہو گیا اور مردہ یہودی قوم نے پھر زندگی حاصل کی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہو گئی اور وہ اسی نہج زندگی کی طرف لوٹ آئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔ فارس کے زیرِ اقتدار یہودیوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی، سکندر نے ۳۳۲ ق۔م میں اس پر ضرب کاری لگائی اور فلسطین کی آزادی کا مالاً مسلوب کر لی۔ ۳۲۰ ق۔م میں بطلیموس (PTOLMY) نے مصر کے راستے حملہ کیا۔ اور یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ یونانیوں (مصری بطلیموسوں) نے یہودیوں پر خوب مظالم کئے۔

حتیٰ کہ ۶۶ء ق۔م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تمہید شروع ہو گئی جن کا ذکر صحفِ یہود میں اور جن کے آثار ان کی پیشانیوں میں جھلک رہے تھے۔ پاپی (رومی) آگے بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں تقریباً بارہ ہزار یہودی تباہ ہو گئے۔ ۵۱ء ق م کے قریب ایک اور یورش میں تیس ہزار یہودی غلام بنا لئے گئے۔ اور ڈھور ڈنگر کی طرح فروخت ہوئے۔

فطرت کی طرف سے انہیں باز آفرینی کا ایک اور موقع دیا گیا اور ان حضرت عیسٰیؑ مبعوث ہوئے لیکن یہودیوں نے حضرت عیسٰیؑ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد ان کی آخری بربادی کا وقت آگیا۔ رومیوں نے سنہ ۷۰ء میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس بدبخت قوم پر ابدی ہلاکت کی مہر ثبت کر دی۔ اس کے بعد یہ قوم دشت پیمائیوں اور صحرانوردیوں میں ذلیل و خوار رہی۔ "قبل مسیح"، بعد مسیح میں بدل گیا۔ لیکن یہودیوں کے مصائب میں کمی نہ ہوئی۔.....

۱۳۵ء میں شاہ ہیڈرین (HADRIAN) نے یروشلم پر قبضہ کیا اور اسے مکمل طور پر غارت کر دیا اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال کر چار دانگ عالم بکھیر دیا۔

آئندہ سال یروشلم میں

فلسطین سے نکل کر یہودی جس جس ملک میں گئے وہیں آباد ہو گئے وہیں کے باشندے بن گئے۔ فلسطین میں ان کی تعداد بمنزلہ صفر کے رہی۔ ان میں سے بعض البتہ فلسطین کے خواب ضرور دیکھتے رہے اور وقتاً فوقتاً، قطرہ قطرہ فرداً فرداً فلسطین میں واپس آتے گئے۔ ان کی مراجعت کی ایک حد تک وجہ، یادِ وطن، تھی اور ایک حد تک یہ مذہبی آرزو اور عقیدہ کہ فلسطین خدائے یہودہ (JEHORAH) نے ان کے لئے مقدر کر دیا ہے۔ "دشمن" کی فتوحات اور "اپنی" شکستیں "تقدیر" کے اس لکھے کو مٹا نہیں سکتیں۔ یہ آرزوئے "وطن" مذہبی عقیدہ سے مذہبی رسم میں بدل گئی۔ چنانچہ ہر سال (PASSOVER) کی ضیافت میں یہ الفاظ دہرائے جاتے رہے کہ "آئندہ سال یروشلم میں"۔

یہودی تاریخ ساز نہیں بلکہ تاریخ کی ساخت ہیں۔ انہوں نے تاریخ کو بنایا نہیں بلکہ وہ تاریخ سے بنے ہیں۔ جب صحراؤں کی خاک چھانتے کے بعد ارضِ مقدس موعودہ میں داخل ہوئے ہیں تو تاریخ کے قابلِ ذکر ابواب ان کی آس پاس کی قوموں کے ہاتھوں لکھے جا چکے تھے۔ انہوں نے نہ کلچر کو ترقی دی، نہ تہذیب و تمدن میں ہی کچھ خاص اضافہ کیا۔ ان کی حکومت اور تشخص قومی کا دور مختصر اور ناقابلِ رشک تھا۔ جب بھی ان کے پاس کچھ دولت جمع ہو جاتی، اور فراغت کے آثار نمایاں ہونے لگتے، کوئی نہ کوئی غارت گر آ پہنچتا اور ان کو تباہ و برباد کر کے چلا جاتا۔ بخت نصر کے ہاتھوں جب ان کی تباہی ہوئی تو پھر تاریخ کا رہا سہا رشتہ بھی ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ شاہِ فارس سائرس نے ہر چند انہیں فلسطین واپس آنے کی اجازت دے دی لیکن چونکہ اسارت کا زمانہ ساٹھ سال کا ہو چکا تھا، اس لئے کم تعداد میں یہودی واپس آئے اور جو آئے وہ بھی اصلی یہودی نہیں تھے۔ ان کا تشخص مٹ چکا تھا اور ذلت و مسکنت کی لعنت ان پر مسلط ہو چکی تھی۔

زمان و مکان کے پاس یہودیوں کے ظلم و استبداد کے سوا کچھ نہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانہ میں وہ دیگر

اقوام کا تختۂ مشق بنے رہے۔ جب عیسائیت کا دور دورہ شروع ہوا تو اس حقیقت کے باوجود کہ حضرت مسیحؑ یہودی تھے اور ان کے اوّلین حواری بھی یہودی تھے، ان کو دشمنانِ مسیحیت سمجھ کر مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ عیسائی سلطنت میں یہودیوں کے لئے چنگڑ خانے بنائے گئے۔ معاش کی راہیں ان کے لئے مسدود کردی گئیں اور ان کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ان کے لئے سود خواری کے سوا کوئی راہِ معاش نہیں تھی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انہیں طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ اور بے دردی اور سفّاکی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ پوپ پیئس پنجم کے ایک حکم سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں پرانے کپڑے بیچنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ یہ قوی سزا اس کی ایک جرم کی پاداش میں تھی کہ وہ یہودی تھے۔

انقلابِ فرانس نے عوام کا نظری مرتبہ بلند کیا۔ اور خیالات و نظریات میں جو رواداری اور کشادہ نگہی پیدا کی وہ یہودیوں کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ ۱۷۸۹ء یہودیانِ یورپ کے لئے ایک نئی صبح کا پیغام تھا۔ آئندہ سو سال میں روس کے سوا ہر جگہ ان پر سے پابندیاں ہٹادی گئیں۔ اب وہ معزز شہری بن سکتے تھے، گاڑیوں میں سفر کرسکتے تھے، زمین کے مالک بن سکتے تھے۔ اور دیگر آزاد شہریوں کی طرح آزادانہ کام کرسکتے تھے۔ اس کے باوجود شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا ملک ہو، جہاں ان کے خلاف کسی قسم کی نفرت نہ پائی جاتی ہو۔ کم یا زیادہ نفرت ضرور پائی جاتی ہے۔ ان مراعات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور یہودی جہاں کہیں آباد تھے، وہیں کے مستقل باشندے بن گئے۔ وہ کوئی دو ہزار سال سے غریب الدّیار اور بے وطن مارے مارے پھر رہے تھے۔ فلسطین، جس میں شاید ہی کبھی وہ اطمینان سے رہ سکے ہوں، ان سے چھن چکا تھا۔ وہ ان کی نگاہوں میں بدستور مقدّس تھا۔ اور اس احساس تقدس کا مظہر وہ (PASSOVER) کی سالانہ ضیافت تھی۔ جہاں "آئندہ سال یروشلم میں" کا لفظی ورد کیا جاتا تھا۔ اس رسم میں اس امید کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ یہودی کسی نہ کسی دن، کسی نہ کسی طرح ہیکل سلیمان (TEMPLE OF SOLOMAN) کی ازسرِ نو تعمیر کریں گے۔ یہودیوں کی یہ مقدّس آرزو مستقل خطرہ ہے۔ کیونکہ ہیکل سلیمان کی جگہ، مسجدِ عمرؓ استوار ہے۔ ایک کی تعمیر، دوسری کی تخریب ہے۔ عرب (مسلمان) کہ حضرت سلیمانؑ کو بھی اپنا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، سلیمان کے ہیکل کو اپنی مسجد سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہیکل کی مسجد میں "تبدیلی" نہ تخریب ہے نہ نئی تعمیر۔ بلکہ ان کے نزدیک یہ سلک مسلسل ہے۔ یہودیوں کے نزدیک تعمیر مسجد غصب ہے وہ اسے برباد کرکے ہیکل کی تعمیر کے متمنّی ہیں۔ یہ بنیادی فرق علّت ہے اس نزاعِ خونیں کی جس کی زد میں فلسطین ہے۔

مسلمانوں کی آمد

حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی کے عہد میں، یعنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کوئی چار ہی سال بعد ۶۳۶ء میں مسلمانوں نے فلسطین پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۱۷ء تک کہ جنرل ایلن بی نے ترکوں سے اسے فتح کرلیا۔ سوائے اس عرصہ کے کہ صلیبیوں نے لاطینی حکومت قائم کی، فلسطین پر ہمیشہ مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ دسویں صدی میں

عربی قوت و شوکت ان کی قبائلی عصبیت لہٰذا خانہ جنگی کے ہاتھوں کمزور ہو چکی تھی۔ ان کے مقابلہ میں ترک ابھر رہے تھے۔ گیارھویں صدی میں سلجوتی ترک میسوپوٹیمیا پر حملہ آور ہوئے۔ اور خلیفۂ وقت کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ گو بظاہر اسے خلیفہ ہی رہنے دیا۔ انہوں نے ۱۹۱۷ء تک ایشیا سے بازنطینی حکومت کا مکمل استیصال کر دیا۔ سلجوقیوں نے ۱۰۷۵ء کے قریب یروشلم پر بھی قبضہ کر لیا اور تابوتِ مقدس کو تباہ کر دیا۔ اس غارت نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ پوپ نے مقدس صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کر دی۔ تاکہ "کافر" ترکوں سے پورا انتقام لیا جائے۔ ایک ناکام کوشش کے بعد ۱۰۹۹ء میں، پاپائیانِ یورپ نے یروشلم پر حملہ کیا اور ایک ماہ کے محاصرے کے بعد اُسے فتح کر لیا۔ یروشلم کی گلیوں میں اس قدر کشت و خون ہوا کہ گھوڑوں کے ٹاپوؤں سے خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر سواروں پر پڑتے تھے۔ سنہ ۱۱۰۰ء میں لاطینی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۱۶۹ء میں غازی صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کے منتشر قوی کو مجتمع کیا اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۱۸۷ء میں مسلمانوں کا یروشلم پر قبضہ ہو گیا۔ مسیحیوں نے شکست کھا کر تیسری صلیبی جنگ کی طرح ڈالی مگر ناکام رہے۔ چوتھی صلیبی جنگ برائے نام تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوبی دور کے بھرپور وار کے بعد صلیبی بالکل نہیں سنبھل سکے۔ اور مسلمانوں کے مقابلہ میں پھر کبھی نہ آسکے۔ اس کے بعد تاتاریوں کی ہلاکت سامانی کا سیلاب آیا اور گذر گیا۔ ازاں بعد ترکانِ عثمانی اُٹھے جو یورپ میں بھی داخل ہو گئے۔ تھریس، بلغاریہ، مقدونیہ اور سرویا تک کو فتح کر لیا۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد خلافت کا اعلان کر دیا گیا جس کا الغا ۱۹۲۳ء میں مصطفٰے کمال کے ہاتھوں ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں جنرل ایلن بی کے ہاتھوں فلسطین انگریزی قبضہ میں چلا گیا۔ تاریخ کے ان نشیب و فراز میں فلسطین اپنی جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر فاتحین کی جنگ آزمائیوں کا میدان بنا رہا۔

صیہونیت

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے فلسطین سے نکل جانے کے بعد یہودیوں کی آبادی فلسطین میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ یہودی جو بے چارگی کے عالم میں پیچھے رہ گئے تھے وہ اسی حال میں رہتے رہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کہ یہ عرصہ مغربی قوائے استعمار کی خصوصی سرگرمی کا حامل ہے، بیرونی یہودیوں نے فلسطین میں قدرے دلچسپی لینی شروع کی۔ استعماریت کے پس منظر میں فلسطین کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے پیشِ نظر ناگزیر تھا۔ تمام قوتیں اس اہم مرکز پر تسلط جمانا چاہتی تھیں۔ یہودیوں کی موجودگی سے عربوں کی اہمیت اور قبضہ کو کم کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ کچھ یہودی خریدی ہوئی زمینوں پر آباد ہو گئے اور اس طرح "نئی آبادیوں" کی طرح ڈالی۔ لارڈ راس چائلڈ اور دیگر امیر ترین یہودیوں کی بدولت سرمایہ کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بلکہ مسرفانہ خرچ کیا جا سکتا تھا۔ متواتر پروپیگنڈے اور خیرالتوں سے بیرونی یہودیوں کو جو اطمینان سے اپنے اپنے ملکوں میں رہ رہے تھے اور مطلقاً ترکِ وطن کے لئے تیار نہ تھے، ان کو رعب اور لالچ سے مجبور کیا گیا کہ وہ فلسطین جائیں زمینیں خریدیں اور نئی یہودی آبادیاں بسائیں۔ لارڈ راس چائلڈ اور دوسرے سرمایہ دار یہودیوں نے ان آبادیوں

کے قیام و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس عالم گیر یہودی جدّوجہد کا چنداں خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بیسوی صدی کے آغاز میں یہودیوں کا تناسبِ آبادی بمشکل پانچ فی صد تھا جو پہلی عالم گیر جنگ کے آغاز تک سات فی صد سے زیادہ نہ ہو سکا۔ اختتام جنگ پر ۱۹۱۹ء میں یہ تناسب دس فی صد تھا۔ گویا سرمایہ کے بے تحاشہ صرف کے باوجود فلسطین اختتام جنگ اوّل تک مکمل عربی ملک تھا۔ کیونکہ عرب آبادی نوّے فی صد تھی۔

یہودی سرمائے اور پروپیگنڈے کو بین الاقوامی حالات نے کافی کمک پہنچائی۔ ۱۸۸۱ء میں روس اور رومانیہ میں آباد یہودیوں پر مظالم کا بے پناہ ریلا آیا۔ یہودی چاروناچار ان ممالک سے نکل پڑے۔ ان تارکینِ وطن کی حقیر سی تعداد عازم فلسطین بھی ہوئی۔ ان دنوں یورپ میں ایک انجمن "محبّانِ صیہون" (CHOVEVE ZION) قائم ہوئی جس نے یہودی تارکین وطن کا رُخ سوئے فلسطین پھیرنے میں خاصی سرگرمی دکھائی۔ ۱۸۹۷ء میں ایک آسٹروی صحافی (THEODOR HERZL) نے صیہونی سوسائٹی (ZIONIST SOCIETY) قائم کی۔ ہرزل کا مقصد یہ تھا کہ یہودی قومی اسٹیٹ میں اکٹھے ہو جائیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ایسی اسٹیٹ فلسطین میں ہو۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ ۱۹۰۳ء میں جب برطانوی حکومت نے یوگنڈا (UGANDA) کو بطور موزوں یہودی سلطنت (قومی وطن) کے پیش کیا تو ہرزل نے اسے قبول کر لیا۔ البتہ جب یہ پیش کش صیہونی کانگرس کے سامنے آئی تو اس نے نامنظور کر دی۔ اس وقت ہرزل کا انتقال ہو چکا تھا۔ صیہونیت کا صدر مقام برلن تھا۔

یہودی استحقاق

فلسطین پر یہودی استحقاق بنایا جاتا ہے۔ اسی غرض سے ہم نے اوپر یہودی تاریخ کے اس حصہ کا سرسری جائزہ لیا ہے جو فلسطین سے متعلق ہے۔ اس مختصر سے تبصرہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہودی فلسطین پر ایک قلیل مدّت کے لئے حکمران رہے۔ اس زمانہ اقتدار میں ہر چند انہوں نے مقامی باشندوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں صرف مغلوب کر سکے فلسطین سے ختم نہ کر سکے، نہ اکھاڑ پھینک سکے۔ اس مختصر دورِ حکومت کے علاوہ ان کی ساری داستان ذلت و مسکنت اور تباہی اور بربادی کی داستان ہے۔ وہ ایک دفعہ فلسطین سے بے دخل ہوئے تو دو ہزار سال تک اس کی بازیافت کر سکنا تو درکنار اس میں معقول تعداد میں آباد بھی نہیں ہو سکے۔ ان کا فلسطین پر حق چند سالہ حکومت سے ہے۔ تاریخ و سیاست اوّل الذکر حق کو مطلقاً تسلیم نہیں کرتی۔ تاریخ ایک بھی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کوئی ملک کسی قوم کی تحویل میں اس لئے دے دیا گیا ہو کہ عہدِ ماضی میں وہ اس پر فرمانروا رہ چکی ہے۔ سیاست کا کوئی اصول اس دلیلِ بے معنی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر یہ دلیل حقِ ملکیت کے حق میں دی جا سکتی ہے تو اس کا فائدہ عربوں کو ملنا چاہیئے، نہ کہ یہودیوں کو۔ فلسطینی (عرب) ہمیشہ فلسطین کے مالک رہے ہیں۔ وہ اس پر حکمران رہے ہوں، یا کسی اور قوم کے محکوم، وہ فلسطین کے مالک رہے، اسی سرزمین سے اٹھے اور اسی خاک میں مدفون ہوئے۔ ان کا جسمانی تعلق فلسطین سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ یہودیوں کو فلسطین بخش دینے کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے پہلے ان سے چھینا جائے جو اس کے

جاتے ہیں۔ لیکن عربوں کے حق میں تو یہی کافی ہے کہ وہ اس ملک میں رہیں اور اس کے بدستور مالک رہیں۔ ان کے ہاں انتقالِ ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک فلسطین سے یہودیوں کی جذباتی وابستگی اور "آئندہ سال یروشلم میں" کی سالانہ رسم کا تعلق ہے اس کی حقیقت رسمِ کہن کے رسمی اعادہ سے زیادہ نہیں۔ اب تک جو یہودی فلسطین میں آکر آباد ہوئے ہیں۔ وہ، وہ ہیں جنہیں ان کے آبائی وطن سے نکال دیا گیا ہے۔ اور جنہیں صیہونی سوسائٹیوں نے مجبور کر کے فلسطین کی جانب بھیجا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے یہودی ترکِ وطن کر کے فلسطین میں نہیں آجاتے؟ کیا وہ ان یہودیوں کے مقابلہ میں جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنہوں نے فلسطین میں پناہ لی، کم ایمان دار یہودی ہیں؟ بات صاف ہے۔ چونکہ ان یہودیوں پر ظلم و تعدی نہیں ہو رہا، اس لئے "آئندہ سال یروشلم میں" میں دہرانے کے باوجود اپنا ملک چھوڑ کر فلسطین جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ خود راس چائلڈ اور دیگر سرمایہ دار یہودی فلسطین میں آکر آباد نہیں ہوتے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فلسطین یہودیوں کا قلبی مطالبہ نہیں، بلکہ خصوصی اغراض و مصالح سے انہیں عرب مظلومین پر ٹھونسا جا رہا ہے اور عربوں کو آبائی وطنوں سے نکالا جا رہا ہے۔ اس طرح ان بدبختوں کے لئے اور مصیبت، پیدا کی جا رہی ہے۔ یہودیوں کو یوں فلسطین پر ٹھونسنا، حملہ کرنے کے مترادف ہے۔

یہودی استحقاق کی دوسری وجہ مذہبی ہے۔ حضرات موسیٰؑ اور عیسیٰؑ فلسطین کے پیغمبر تھے اور یہودی، اوّل الذکر کو اپنا قومی ہیرو تصوّر کرتے ہیں۔ یروشلم یہودیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ یہ دلیل دیتے وقت اس بیّن حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ خود عربوں کے لئے فلسطین اتنا ہی تقدس کا حامل ہے جتنا یہودیوں کے لئے۔ وہ پیغمبر جنہیں یہودی اپنا سمجھتے ہیں درحقیقت اسلام (لہٰذا مسلمانوں) کے پیغمبر ہیں۔ مسلمان ان پیغمبروں کا احترام ہی نہیں کرتے ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی اس خاک کا ذرّہ ذرّہ مقدّس ہے کہ وہ عروج و زوالِ اقوام کی الٰہی مشیّت کے پروگرام کا آئینہ بردار ہے اور ایمان و عمل کی بے نظیر تجربہ گاہ۔ مسلمان کی تاریخ فلسطین کے بغیر نامکمل ہے۔ مسلمان ہونے کے اس رشتۂ عزیز کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا اور اُسے جان سے عزیز تر رکھا، اب وہ اسے ہاتھ سے کیسے جانے دے سکتا ہے؟ یہودی اس رشتہ کو دو ہزار سال سے گم کر چکا ہے۔ وہ اسے ہاتھ میں لے سکتا ہے تو مسلمان کا سینہ چیر کر۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن مقامات پر مسلمان کا سینہ دونیم ہوا ہے وہ تاریخ کے فیصلہ کن مقامات تھے۔ آج ہم پھر ایسے ہی فیصلہ کن مقام پر ہیں۔ زندہ قوموں کا ہر مرحلہ ہوتا ہی فیصلہ کن ہے!

عرب

یہودی تاریخ کے سرسری جائزہ سے ان کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عربوں کی تاریخ دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ یوں بھی عربی تاریخ ایسا گم شدہ باب نہیں جسے کوشش سے نمایاں کیا جائے۔ البتہ رابطہ قائم کرنے کے لئے ہم مختصراً تازہ ابواب پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ترکوں کے دورِ حکومت میں عالمِ عرب پر عمومی طور پر جمود چھا گیا۔ ان کے بیداری کے آثار ۱۷۴۷ء سے شروع ہوتے ہیں جب اس

تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی جسے وہابی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز عرب سے محمد ابن عبدالوہاب نے کیا جس کا مقصد اسلام کو ان آلائشوں سے پاک کرنا تھا جو دمشق اور بغداد میں اس کا لازمہ بن چکی تھیں۔ چونکہ ترکی حکومت عربوں کے لئے سیاسی غلامی کا باعث سمجھی یا سمجھائی جانے لگی تھی، اس لئے بتدریج ان میں آزادی خواہی کے جذبات پیدا ہوتے گئے۔ وہابی جیسی اصلاحی تحریک نے بیداری کے آثار پیدا کئے تو سیاسی غلامی نے ان کا رُخ سیاست کی طرف بھی پھیر دیا۔ ۱۸۷۵ء میں پانچ نوجوانوں نے مل کر بیروت میں ایک خفیہ سیاسی انجمن کی طرح ڈالی۔ ایسی خفیہ انجمنوں کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ ترکی کے خلاف بھی ہوتی گئیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی اقوام زندگی کی نئی تڑپ محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے فکری ارتقاء میں مادیت کو دخل تھا اور کئی ایک فلسفی وحشیانہ قوت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اقوامِ یورپ قومی تغلب کے نشہ میں بدمست ہو کر دنیا کے مختلف خطوں میں اپنے اپنے وقار کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں۔ ۱۸۶۰ء میں دمشق اور لبنان میں مسلم عیسائی فسادات ہوئے جن میں عیسائیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ ان فسادات کو بہانہ بنا کر نام نہاد عیسائی سلطنتوں نے مشرقِ وسطیٰ کے امور میں دخیل ہونا شروع کر دیا۔ یورپی قویٰ کی یہ مداخلت بتدریج بڑھتی گئی اور غیر یورپی ممالک ان کی باہمی رقابتوں کی آماجگاہ بن گئے۔ برطانیہ برِصغیر پر قابض تھا، وہ انگلستان سے برِصغیر تک کا راستہ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ بحرِ روم اور بحرِ قلزم کے سواحل اس کے لئے مخصوص فوجی اہمیت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس نے ۱۸۸۲ء میں مصر اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے الجیریا (۱۸۳۰) اور ٹیونس (۱۸۸۱ء) پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے بھی مشرقِ وسطیٰ پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا شروع کر دیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اٹلی نے بحرِ روم کو رومی جھیل بنانے کے قصد سے لیبیا کی رگِ جان میں اپنے خونی پنجے گاڑ دیئے۔ یہ سلسلہ جنگِ عالمگیر تک جاری رہا اور ممالکِ اسلامیہ استعمارِ فرنگ کا یا براہِ راست شکار ہو گئے یا بالواسطہ اس کے زیرِ اثر آ گئے۔

اندرونی خرابیوں اور بدنظمیوں اور مغربی قوائے کی ریشہ دوانیوں کے طفیل ترکی، مردِ بیمار، بن چکا تھا۔ ترکی اب تک خلافتِ اسلامیہ کا حامل تھا۔ اس کے دم سے بظاہر ممالکِ اسلامیہ ایک مرکز سے وابستہ تھے۔ یہ وابستگی جذباتی تھی۔ لیکن سیاست نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف شکایات تھیں۔ ترک اندرونی اور بیرونی مصائب میں مبتلا تھے۔ اس پر مستزاد استعمار کا سیلاب اور قویٰ مغرب کی باہمی رقابت تھی۔ آتش فشاں پہاڑ بالآخر پھوٹا، اور ۱۹۱۴ء میں جنگِ عمومی کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ ترکی جنگ میں جرمنی اور آسٹریلیا کا حلیف بنا۔ خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے سلطان ترکی نے جہاد کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا اثر شام یا ممالکِ عربیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ برِصغیر کے مسلمانوں تک بھی تھا۔ برطانیہ کے لئے یہ عظیم الشان خطرہ تھا جس کا سدِباب اشد ضروری تھا۔ کچز کی سیاسی پیش بینی کو اس خطرہ کا احساس جنگ سے

پہلے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۱ء میں وہ حسین ابن علی، شریف مکہ سے، اس کے دوسرے بیٹے عبداللہ کی معرفت مل چکا تھا۔

عرب اور برطانیہ

عرب، خود منفرق اور غیر منظّم تھے۔ حسین، شریفِ مکہ، اپنی خلافت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ترکی کے خلاف انگریز سے سازش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عربوں پر اسے یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ وحدتِ عربیہ پر جمع ہو جائیں گے۔ اس کا دوسرا بیٹا عبداللہ پُر امید تھا۔ وہ والد کی طرف سے کچنر، سٹارس اور بعد میں سر ہنری میکموہن سے مصروفِ گفتگو رہا۔ حسین کا تیسرا بیٹا فیصل ترکی کی حمایت کو ترجیح دیتا تھا، تاکہ اس پر احسان کر کے معاہدۂ امن میں کچھ حاصل کیا جائے۔ حسین نے عبداللہ سے اتفاق کیا۔ بقول لارنس حسین، فیصل سے متنفر بھی تھا۔ چنانچہ حسین نے انگریزوں سے مذاکرات جاری رکھے۔ اس کے ساتھ اس نے الفسطاط، الاحد جیسی انقلابی جماعتوں سے بھی مراسم قائم کر لئے۔ کیونکہ وہ ترکوں کے خلاف کہیں زیادہ باغیانہ سرگرمی رکھ رہی تھیں۔ جنگ جاری رہی۔ انگریز، ترکوں اور جرمنوں کے ہاتھوں ------- پیہم شکستیں اٹھاتے جا رہے تھے۔ اب موقع تھا کہ عالمِ عرب کو ترکوں سے علیحدہ کیا جائے اور اپنے زیرِ اثر کیا جائے تاکہ انہیں ترکوں کے خلاف صف آرا کیا جا سکے۔ ایسے میں حسین اور میکموہن مراسلت کا آغاز ہوا۔ میکموہن مصر میں برطانوی ہائی کمشنر تھا۔

حسین کا مطالبہ عرب آزادی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ عربی حکومت کی مغربی سرحد بحر قلزم اور بحر روم تک ہو۔ اس تحدید میں عرب، عراق، شرقِ اردن، فلسطین اور شام شامل تھے۔ میکموہن نے اسے تسلیم کرتے ہوئے ان اضلاع کو نکال دیا جو دمشق، حمص، حماد اور حلب کے مغرب میں واقع تھے۔ کیونکہ وہ علاقے خالصتاً عربی نہ تھے۔ اس "مغرب" کی بعد میں یہ توجیہہ کی گئی کہ اس سے فلسطین عربی سلطنت کی حدود سے خارج ہو گیا تھا۔ خود میکموہن نے ایک مرتبہ لندن ٹائمز میں لکھا کہ جن علاقوں سے متعلق وعدے کئے گئے تھے ان میں فلسطین شامل نہیں تھا۔ یہ قطعی غلط ہے اس لئے کہ میکموہن نے عربی سلطنت کی حد بحر روم تک تسلیم کر لی تھی۔ اسی سے فلسطین خود بخود عربی حکومت میں آجاتا تھا۔ اگر بغرضِ استدلال اس شرط کو ساقط سمجھ لیا جائے تو نقشہ پر دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فلسطین دمشق کے مغرب میں نہیں بلکہ جنوب مغرب میں ہے ایسی دراز کار اور احمقانہ توجیہیں برطانوی سیاست کا لازمہ ہیں۔ خود پاکستان کو ان کا کس قدر تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ فلسطین کو خارج کرنے کی ایک اور ایسی ہی لچر دلیل دی جاتی ہے۔ میکموہن نے ایک شرط یہ لگائی تھی کہ عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں برطانیہ فرانس کے مفاد کے منافی اقدام نہیں کرے گا۔ فلسطین میں فرانس کا مفاد کچھ بھی نہیں تھا۔ لہٰذا یہ شرط فلسطین کے معاملہ میں ساقط العمل ہو جاتی ہے۔ یوں بھی فلسطین عربی ملک تھا، اس کی عرب آبادی

نوّے فیصدی تھی۔ اس کے اخراج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلسطین کو نکال کر عربی حکومت اور وحدتِ عربیہ کا مطالبہ بے معنی ہو جاتا تھا۔ ایک حلقہ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے، کہ چونکہ انگریز نے فلسطین کو فتح کیا تھا اس لئے اسے حق حاصل تھا کہ وہ اس کا کچھ بھی "استعمال" کرتا۔ قومیں جائیدادیں نہیں ہوتیں کہ ان پر حقِ ملکیت تسلیم کیا جائے اور جیسے جی میں آئے ان کا استعمال کیا جائے۔ بیسویں صدی کی مہذب دنیا میں اس متروک و مردود نظریہ کو اساسِ گفتگو نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ طرزِ استدلال غمازی کر رہا تھا کہ فرنگی ذہن سیاسی استبداد و ظلم سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ ایسے حضرات نے ایبی سینیا پر اٹلی کا حقِ ملکیت کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ انہوں نے چین کے مفتوحہ علاقے میں جاپان کا حق تسلیم کیا۔ اٹلی اور جاپان کے خلاف ان کی دی ہوئی دلیلیں خود ان کی تردید اور تغلیط کے لئے کافی ہیں۔

کرنل لارنس نے جنگ کے دوران عربی جذباتِ وطنیت کو ابھارنے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ایلن بی نے اکتوبر ۱۹۱۷ء میں جب فلسطین میں جارحانہ کارروائی شروع کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریز ایک حلیف ملک میں لڑ رہے ہیں اور ترک دشمن ملک میں ہیں۔ عرب سپاہی ترک فوجوں سے بھاگ بھاگ کر آ رہے تھے۔ اور ترکی عساکر کا سلسلۂ رسد و رسائل درہم برہم ہو رہا تھا۔ ایلن بی کے الفاظ میں عربی کی امداد "بے بہا" تھی۔ لائڈ جارج نے موتمرِ امن (۱۹۱۹ء) میں اعتراف کیا۔

> شاہِ فیصل نے اپنے تمام ذرائع ہمارے سپرد کر دیئے جس سے ہم کو مادی طور پر سب سے زیادہ مدد ان فتوحات میں ملی۔

جنگی امداد کے علاوہ عربوں نے انگریز کو کامیاب و فاتح بنانے کے لئے کیا کیا، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگائیے:۔

> ان (عربوں) کے گھر کی ایک ایک چیز خوراک، خریدنے میں صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ ان کی چھتوں کی ٹائلیں بھی بکنا شروع ہو گئی تھیں ...... (یہ حالت جولائی ۱۹۱۷ء کی ہے) پندرہ ماہ بعد جب بیروت فتح ہوا ہے تو حالات اور بگڑ چکے تھے۔ یہ کہنا شک و شبہ سے مبرّا ہے کہ جنگ کے دوران تین لاکھ شامی فاقوں مر گئے۔ صحیح شمار ساڑھے تین لاکھ کا ہے۔ کوئی تین ہزار جیلوں میں جھونک دیئے گئے جن میں سے بیشتر نذرِ اجل ہو گئے۔ شام کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پانچ لاکھ کے لگ بھگ جنگ میں کام آئی۔
> (THE ARAB AWAKENING)

عربی آزادی

عرب مسلمان تھے۔ انہوں نے ترکی دعوتِ جہاد کی کیوں پروا نہ کی؟ لارنس کے الفاظ میں:۔

> دورانِ جنگ میں عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوت اس لئے نہیں تھی کہ ترکوں

کی حکومت خراب تھی، بلکہ اس لئے کہ عرب آزادی چاہتے تھے۔ انھوں نے جنگ کی آگ میں اپنی جانیں اس لئے نہیں جھونکیں تھیں کہ وہ آقاؤں کی تبدیلی کریں اور برطانوی رعایا بن جائیں یا فرانسیسی شہری، بلکہ وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔

(لارنس کے خطوط)

ترکوں کے دور نے عربوں میں بڑی حد تک جذباتِ قومیت و آزادی پیدا کر دیئے تھے۔ انگریز نے اس کا فائدہ اٹھایا اور عربوں کو آزاد عربستان کا سبز باغ دکھایا۔ عربوں کا اس دام میں آجانا عہدِ ماضی کا قدرتی نتیجہ تھا۔ ترکی اور جرمنی اتحاد کی شکست کی واحد صورت یہی تھی کہ مشرقِ وسطیٰ سے ان کو بے دخل کر دیا جاتا۔ اپنی اہمیت کے پیش نظر مشرق وسطےٰ جنگ کے نتیجہ کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ انگریز نے یہیں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ انگریز کی وسیع سلطنت کے لئے مشرقِ وسطےٰ خصوصیت سے اہم تھا۔ چنانچہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنے کے لئے انگریز نے کمال فراخدلی سے ان سے وعدے کئے۔ چونکہ مقصد عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کرنا تھا، اس لئے وعدوں کی معقولیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں انگریز نے ہر اس چیز کا وعدہ کیا جو وہ کر سکتا تھا اور جس کا نتیجہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنا ہو سکتا تھا۔

عربوں کی شرکتِ جنگ وطنی آزادی کی خاطر تھی اور انگریز نے اس کا حتمی وعدہ کر رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے قول میں کس قدر مخلص تھا، اس کا اندازہ اس وقت کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ میکموہن نے اگست ۱۹۱۵ء میں حسین کو لکھا:۔

لارڈ کچنر نے جو اعلان علی آفندی کی معرفت آپ تک پہنچایا ہے جس میں ہماری ممالکِ عربیہ اور ان کے باشندگان کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

خفیہ معاہدہ

مئی ۱۹۱۶ء میں جب عرب یقینی طور پر انگریزوں کے حلیف بن چکے تھے۔ برطانیہ اور فرانس میں ایک خفیہ معاہدہ (SYKES PICOT AGREEMENT) طے ہوا۔ اس معاہدہ میں ہر چند برطانیہ (اور فرانس) کے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ وہ ایک آزاد عرب حکومت یا مغربی وفاق کے مؤید ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے معاہد ممالکہ عربیہ کو حلقہ ہائے اثر (برطانوی اور فرانسیسی) میں تقسیم کرنے میں اتفاق کر لیا۔ اس معاہدہ کی رُو سے فلسطین کو بین الاقوامی علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے! معاہدہ عربی ممالک سے متعلق ہو رہا ہے اور عربوں سے انگریز کے حتمی مواعید موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فرانس سے یکطرفہ معاہدہ کر لیا جاتا ہے جو اس معاہدہ کی صریح خلاف ورزی ہے جو عربوں سے کیا جا چکا تھا۔ اگر سائیکس، پکٹ معاہدہ برطانیہ کے سابقہ مواعید کے مطابق تھا تو اسے حسین سے پوشیدہ کیوں رکھا گیا؟ کیا یہی بات شک کے لئے کافی نہیں تھی؟ استعمارِ فرنگ کی یہ بد خلاقی اور بد دیانتی بین الاقوامی سیاست کا طرۂ امتیاز ہے اور بین الاقوامی مسائل کی کہ ان میں سے اہم

فلسطین ہے، علّت العلل ہے، روسی حکومت نے اس خفیہ معاہدہ کو شائع کر دیا۔ اور حسین نے فوراً میکموہن کو اس کے متعلق لکھا تو میکموہن نے اسے ترکی کی شرانگیز کوشش قرار دیتے ہوئے عربوں کی یوں تشفی کی کہ برطانیہ پہلے کی طرح عزم مصمم کئے ہوئے ہے کہ وہ وحدت و استقلالِ عربیہ کی تشکیل و تقویم کرے گا۔ انگریز کی اس منافقت کا انکشاف ہونے سے عربوں کے ایک حلقہ میں نہ صرف انگریز سے متعلق بلکہ خود حسین کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ چنانچہ سات عرب زعماء نے برطانیہ کو ایک یادداشت بھیجی جس کے جواب میں وزارتِ خارجہ (برطانیہ) نے (THE DECLARATION TO SEVEN) شائع کیا۔ اس اعلان میں پھر اعادہ کیا گیا۔

> جن عربی ممالک پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کیا ہے، ان کے متعلق ملک معظّم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ان ممالک کی آئندہ حکومت متعلقہ باشندوں کی رضامندی سے تشکیل پذیر ہو۔ جو علاقے ابھی تک ترکوں کے قبضہ میں ہیں، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی خواہش ہے کہ ان علاقوں کے غلام باشندے خود مختاری اور آزادی حاصل کریں۔ ملک معظم کی حکومت اس مقصد کی تکمیل میں بدستور کوشاں رہے گی۔

۷ رنومبر ۱۹۱۷ء کو فلسطین، شام اور عراق کے کونے کونے میں ایک اعلان چسپاں کرایا گیا جس میں تحریر تھا:-

> مشرقِ وسطیٰ میں جرمنی نے جس جنگ کی طرح ڈالی ہے اس میں شریک ہوتے ہوئے برطانیہ اور فرانس کے پیشِ نظر مقصد ان لوگوں کی مکمل اور حتمی آزادی (COMPLETE – AND FINAL LIBERATION) ہے جو اب تک ترکوں کے غلام چلے آئے ہیں نیز ایسی قومی حکومتوں کی تشکیل جو مقامی باشندوں کے آزادانہ انتخاب و فیصلہ کا نتیجہ ہوں گی برطانیہ اور فرانس کسی قسم کا بھی نظام حکومت اپنی طرف سے مسلّط نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ ایسی مؤثر امداد دیں گے جس سے وہ حکومتیں بخوبی چل سکیں۔

عربوں سے ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں، بیسیوں مرتبہ وعدے ہوئے کہ ایک عرب ریاست یا عربی ریاستوں کا وفاق قائم کیا جائے گا۔ لیکن مؤتمر امن اور اس کے مابعد عربوں کو تقسیم اور تقسیم در تقسیم کے سوا کچھ نہ ملا۔ سیریا کو شام، لبنان، فلسطین، عراق اور شرق اردن میں تقسیم کر دیا گیا۔ لبقیہ شام کو آزادی نہیں دی گئی بلکہ مجبور کیا گیا کہ وہ انتداب قبول کرے۔ انتداب، ایک "بدعت" تھی جو جمعیّتِ اقوام نے پیدا کی۔ نہ اس کا عربوں کی طرف سے مطالبہ ہو سکتا تھا، نہ انگریزوں کی طرف سے وعدہ۔ وعدہ خالص آزادی کا تھا جسے پہلو بدل بدل کر ٹالا گیا۔ عراق حسین کے بیٹے، فیصل کو بخش دیا گیا۔ شرقِ اردن اس کے بیٹے عبداللہ کو۔ شام، فرانس کے انتداب میں دے دیا گیا اور فلسطین برطانیہ کے انتداب میں۔ کیا یہ فیصلے ان وعدوں کے مطابق تھے جو جنگ کے دوران عربوں سے کئے گئے تھے؟ کیا عربوں کا مطالبہ انتداب کا تھا؟

کیا یہ نئی حکومتیں مقامی باشندوں کی رضامندی سے متشکل ہوئی تھیں؟ عراق نے انتداب کی مخالفت کرتے ہوئے بامرِ مجبوری امریکی انتداب کو ترجیح دی، لیکن اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یوں مقامی باشندوں کے ان مطالبات، وحسیات کو ٹھکرا دیا گیا جس کے احترام کے حتمی اور مکرر وعدے موجود تھے۔ لارنس لکھتا ہے:-

فرانس نے دیوانہ وار انتداب بدلنے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے شرمناک سودا کر کے اس (فرانس) کی تائید کی۔ تاکہ وہ میسوپوٹیمیا حاصل کر سکے۔ س۔ پ ـــ معاہدہ کی رُو سے فرانس کو ساحلِ ملا اور عربوں کو حلب، حما، حمص، دمشق اور شرقِ اردن۔ انتداب کے صدقے میں اکثر و بیشتر حصے انگلستان اور فرانس نے ہتھیا لئے۔ س۔ پ معاہدہ تحدید میں احمقانہ تھا مگر اس میں شام کا حقِ مختاری تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ (معاہدہ) آئندہ فیصلے سے دس ہزار گنا بہتر تھا۔ سط ۲)

اعلان بالفور

برطانیہ کو چونکہ جنگ میں عربوں کی امداد کی ضرورت تھی، اس لئے اس نے ان سے رنگا رنگ وعدے کئے۔ برطانیہ کو اسی طرح یہودیوں کی امداد کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے عربوں کی طرح یہودیوں سے مبالغہ آمیز اور غیر دیانتدارانہ وعدے کئے۔ پہلی عالمگیر جنگ میں، کہ جس کے سیاسی پس منظر کے ایک پہلو کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، جرمنی کی للچائی ہوئی نظریں مشرقِ وسطےٰ پر تھیں۔ وہ یہودیوں کی امداد حاصل کرنے کے لئے موہوم وعدے کر سکتا تھا۔ انگریز نے جرمنی کے وعدوں کو کھوکھلا کرنے کے لئے اس پر سبقت لے جانا چاہی۔ چنانچہ یہودیوں کو بھی عربوں کی طرح سبز باغ دکھائے گئے۔ ان متضاد وعدوں کی دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ میں یہودیوں کا بے پناہ اثر تھا۔ وہ نہ محض امریکی پریس پر ہی چھائے ہوئے تھے بلکہ حکومت کی پالیسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ برطانیہ، امریکہ کو اپنی طرف سے جنگ میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ کے بغیر جنگ کے لئے نہ مطلوبہ سرمایہ فراہم ہو سکتا تھا، نہ مطلوبہ بارود اور اسلحہ۔ امریکہ کو شریکِ جنگ کرنے کا ایک ذریعہ یہودی تھے۔ تیسری وجہ ڈاکٹر وائز مین، صدر ذائنسٹ ایسوسی ایشن نے مہیا کی۔ کیمیادان وائز مین نے کیمیائی جنگ کے سلسلہ میں کوئی اہم انکشاف کیا جسے اس نے برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ برطانیہ اس احسان کا بدلہ ضرور دینا چاہتا تھا اور وائز مین نے ذاتی انعام سے انکار کر دیا تھا۔ ان سب الجھنوں کا حل اعلانِ بالفور ہے جو ۲ر نومبر ۱۹۱۷ء کو شائع ہوا۔ اس میں مرقوم تھا:-

ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کو بنظرِ استحسان دیکھتی ہے اور امکانی کوشش کرے گی کہ اس کا حصول آسان ہو جائے۔ یہ واضح رہے کہ ایسا کوئی اقدام نہیں کیا جائے گا جس کی زد فلسطین میں موجودہ غیر یہودی فرقوں کے شہری اور مذہبی حقوق پر پڑے یا یہودیوں کے اس سیاسی مرتبہ اور حقوق پر جو انہیں دیگر ممالک میں حاصل ہیں۔

اعلانِ بالفور ایک اہم سرکاری دستاویز ہے کہ جس کی رُو سے یہودیوں اور عربوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس عجیب وغریب دستاویز میں کہیں عربوں کا ذکر نہیں۔ فلسطین کی آبادی میں اختتامِ جنگ پر نوّے فی صدی عرب تھے اور صرف دس فی صدی یہودی۔ لیکن اس بدقسمت ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ذکر ہوتا ہے تو یہودیوں کا اور غیر یہودی فرقوں کا۔ گویا فلسطین میں بیشتر یہودی آباد تھے اور عرب اقلیت تھے، ایسی اقلیت کہ اسے "غیر یہودی" فرقہ کی غیر واضح اور مبہم اصطلاح سے ہی یاد کیا جا سکتا تھا۔ اس سارے اعلان میں 'عرب' کا لفظ تک نہیں۔ اور مدبرین و سیاستدان عربوں کی قسمت کا فیصلہ چکا رہے تھے۔ فلسطین کے اوّلین باشندے کون تھے؟ یہ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ یقینی ہے کہ عرب (مسلمان) تیرہ سو سال سے اس ملک پر قابض و متمکن چلے آ رہے تھے۔ یہودی دو ہزار سال سے اس ملک سے بے دخل تھے۔ اور اس دو ہزار سال میں ان کی زیادہ سے زیادہ آبادی دس فی صدی ہو سکی تھی۔ کیا دو ہزار سالہ تاریخ کا نوشتہ مٹایا جا سکتا ہے؟ کیا اتنے طویل سفر سے رجعت ممکن ہے؟ کیا انگریز یا کوئی طاقت تاریخ کے فیصلے کو الٹ سکتی ہے؟ کیا یہودیوں کو فلسطین اس لئے دیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی دو ہزار سال بیشتر اس میں آباد تھے؟ اس کے بعد وہ بھیڑ بکریوں کی طرح وہاں سے بکھیر دیئے گئے اور پھر کبھی اتنی قوت بھی مجتمع نہ کر سکے کہ اس مقدّس ملک پر تسلط جما سکیں؟ کیا اب انگریزوں کو محض اس لئے جرمنی کا ملک دیا جا سکتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کبھی جرمنی میں آباد تھے؟ یا انگلستان جرمنی کو بدیں وجہ بخشا جا سکتا ہے کہ اسے کبھی جرمن اسلاف نے فتح کیا تھا؟

یہودی وطن نہ کہ یہودی حکومت

بہر کیف اعلانِ بالفور نے "قومی وطن" کا وعدہ کیا، نہ کہ قومی حکومت کا۔ لیکن اس کے بعد کی ساری سیاست اسی نقطہ کے گرد گھوم رہی ہے کہ فلسطین یا اس کے کسی حصّہ میں یہودی حکومت قائم ہو جائے۔ "قومی وطن" ایک بالکل نئی اصطلاح تھی، لہٰذا دیانت کا تقاضا تھا کہ اس کے معانی متعیّن کر دیئے جاتے تاکہ فریقین غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس سے پہلے کبھی بھی یہ مضحکہ خیز تصوّر پیش نہیں ہوا تھا کہ کسی ایک قوم کو کسی اور قوم کے ملک میں قومی وطن دے دیا جائے۔ اس اصطلاح کو قصداً مبہم رکھا گیا تاکہ جانبین کو اس حسین مغالطہ میں رکھا جائے کہ ان کے حقوق محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس کے معانی یہودیوں نے کیا سمجھے؟ اس کا اندازہ وائزمین کے ایک اعلان سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا کہ اب فلسطین ایسی ہی یہودی مملکت بن جائے گی جیسی کہ انگلستان انگریزوں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بالفور نے زبانی اس مجذوب کی بڑ کی تائید بھی کی تھی۔ لیکن کیا آئین و قانون میں زبانی وعدے کوئی حقیقت رکھتے ہیں؟ بالخصوص ایسے وعدے جنہیں ضبطِ تحریر میں لانے سے خاص طور پر گریز کیا جائے؟ وہ استغاثہ کی بنیاد نہیں بن سکتے نہ فیصلہ کی اساس ہو سکتے ہیں۔ کیا ایسے زبانی وعدے کسی ملک پر اس کی منشاء و رضامندی کے خلاف مسلّط کیئے جا سکتے ہیں؟

شاہِ فیصل نے اعلانِ مذکورہ کو غیر مشروط تسلیم نہیں کیا بلکہ اس سے متعلق معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے تحریر کیا:۔

> بشرطیکہ عرب اپنی آزادی حاصل کر لیں...... لیکن اگر معمولی کمی بیشی بھی ہو گئی تو میں اس اعلان کے ایک لفظ کو بھی نہیں مانوں گا۔ اور یہ اعلان ساقط العمل، بیکار اور ناجائز ہو جائے گا۔ اور میں کسی طرح بھی کسی قسم کا جواب دہ نہیں رہونگا۔

یہ غیر مبہم تحریر ہے اور اس کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ اعلانِ بالفور عربوں کی آزادی میں منتج ہو تو قابلِ عمل ورنہ بے کار، ناجائز، ساقط العمل! اس اعلان نے یقیناً عربوں کو آزادی نہیں دلائی بلکہ انہیں اور پابندِ سلاسل کر دیا ـــــ لہٰذا عرب اس کا ایک لفظ بھی ماننے پر مکلّف نہیں ـــــ لہٰذا اعلان ساقط العمل! اب اسے اساسِ مذاکرات بنانا یعنی چہ!! اس کے بعد معاہدہ لوزان (۱۹۲۳ء) کی رُو سے فلسطین کو برطانوی انتداب میں دے دیا گیا جس کی اساس اعلان بالفور پر استوار تھی۔

برطانوی وعدے

یہ ظاہر ہے کہ جنگ کے دوران میں ان کی امداد و تائید حاصل کرنے کے لئے برطانیہ نے عربوں سے بھی وعدے کئے اور یہودیوں سے بھی۔ یعنے پہلے عربوں سے اور پھر یہودیوں سے۔ یہ وعدے یا تو ایک دوسرے کی ضد ہیں یا باہمی طور پر مطابق۔ اگر متضاد ہیں تو اخلاقاً اور قانوناً وہ وعدے قابلِ قبول و عمل ہیں جو پہلے کئے گئے۔ کیونکہ ایک قانونی ضمانت دے دینے کے بعد انگریز اس سے متضاد وعدہ کسی اور فریق سے نہیں کر سکتے تھے لہٰذا برطانیہ کے وہ وعدے جو یہودیوں سے کئے گئے اور عربوں سے کئے گئے، وعدوں کی ضد ہیں، غیر قانونی اور قابلِ استرداد ہیں۔ اگر وہ وعدے ایک دوسرے کے مطابق ہیں تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عرب اپنی آزاد حکومت قائم کر سکتے ہیں اور انگریزوں کا ہرگز یہ منشاء نہیں تھا کہ کسی عرب ملک میں کسی غیر عرب (یہودی) کی سلطنت قائم کریں یا اسے بزورِ شمشیر مسلّط کریں۔ اس سے فیصلہ انتداب بھی غلط ہو جاتا ہے اور فیصلہ تقسیم بھی۔ اگر تینوں فریقوں یعنی برطانیہ، عربوں اور یہودیوں میں سے کوئی ان وعدوں کا مفہوم کچھ اور لیتا ہے تو اس کے حل کی بہترین صورت یہ ہے یا تھی کہ تحریری دستاویزات کو، کہ وہی وجہ نزاع ہیں، بین الاقوامی عدالت میں برائے فیصلہ پیش کیا جاتا۔ برطانیہ نے ایسا کرنے کی بجائے معاملہ جمعیتہ اقوامِ متحدہ کے سپرد کیا جس نے عربوں کی مرضی کے خلاف برطانوی وعدوں کو ٹھکراتے ہوئے فلسطین (اور بعض دیگر عربی ممالک) کو انتداب کی لعنت میں گرفتار کر دیا جمعیتہ اقوام ایسا کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ معاہدۂ امن کی خبر پا کر عربوں نے جولائی ۱۹۱۹ء میں دمشق میں ایک موتمر طلب کی۔ اس موتمر کی قراردادوں میں ہے:۔

> ہم جنوبی شام میں جس کو فلسطین کہا جاتا ہے، یہودیوں کے اس مطالبہ کو رد کرتے ہیں کہ وہاں یہودی دولتِ مشترکہ (JEWISH COMMON WEALTH) قائم ہونی چاہیئے۔ ہم یہودیوں کے داخلہ فلسطین کے ہی مخالف ہیں۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان

کا ایسا حق ہے اور ہم ان کے مطالبات کو اپنی قومی، سیاسی اور معاشی زندگی کے منافی سمجھتے ہیں۔ ہمارے (موجودہ) یہودی شہری ہماری طرح ملکی حقوق و فرائض میں بدستور شریک رہیں گے۔

ممالکِ عربیہ میں عام جذباتِ نفرت پھیل گئے۔ ان کا خون، ان کی قربانیاں سب اکارت گئی تھیں۔ عربی حمیت، قومی خودداری کی یہ تذلیل کب دیکھ سکتی تھی؟ انہوں نے بچے ذبح کرائے، جوان قربان کئے، مصیبتیں جھیلیں، ملک برباد کرائے، اس امید پر کہ وہ آزادی سے ہمکنار ہو سکیں گے۔ لیکن اس سرفروشی اور ایثار پیشگی سے ملا تو کیا؟ —— غلامی! لعنت و ذلّت!!

فیصل نے تنگ آکر ایک کمیشن کا مطالبہ کیا جو جملہ امور کی تحقیقات کرے۔ برطانیہ اور فرانس کو اپنی شیطنت کاریوں اور ریشہ دوانیوں کا علم تھا۔ انہوں نے اس منصفانہ مطالبے کو تسلیم نہیں کیا۔ البتہ امریکہ نے کہ اس وقت تک غیر جانبدار تھا، اس کا خیر مقدم کیا۔ نتیجہ کنگ، کرین رپورٹ کی صورت میں نکلا۔ یہ رپورٹ اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ غیر جانبدار اشخاص کی مرتب کردہ ہے۔ اس رپورٹ میں متشدّد صیہونیوں کی مذمّت کی گئی جو غیر محدود داخلہ فلسطین پر مصر ہیں۔ انہوں نے اس پر بھی زور دیا کہ قومی وطن قومی حکومت نہیں۔ ایسا کرنا "غیر یہودی فرقوں" کے مدنی اور مذہبی حقوق کو پامال کئے بغیر ناممکن ہے۔ واضعین رپورٹ نے تسلیم کیا کہ وہ ابتداءً یہودیوں کے حامی تھے۔ اس کے باوجود حقائق و واقعات کا مطالعہ کرکے انہوں نے مؤتمر امن کو مشورہ دیا۔

یہودیوں کا داخلہ فلسطین، یقینی طور پر محدود ہونا چاہیئے اور فلسطین کو یہودی دولتِ مشترکہ بنانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہیئے۔

خلافِ صیہونیت تحریک

۱۹۱۹ء کے بعد حالات کی رفتار بدل گئی کیونکہ ہمہ گیر خلافِ صیہونیت تحریک پھیل گئی جس سے یہودی کثیر تعداد میں سابقہ وطن ترک کرکر کے فلسطین میں آنا شروع ہو گئے۔ ان تارکینِ وطن یہودیوں کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا تو ان میں سے اکثر یقیناً فلسطین کا رُخ نہ کرتے۔ فلسطین یہودی بے وطنی، اور غربت کا حل نہیں۔ لیکن صیہونی سوسائٹیوں نے اس مصیبت کا فائدہ اٹھایا اور اس سیلاب کو فلسطین کی جانب پھیر دیا۔ ۱۹۳۲ء میں ہٹلر برسرِ اقتدار آیا۔ ہٹلر، پہلی عالم گیر جنگ میں جرمنی کی شکست کا ذمہ دار بہت حد تک یہودی سازشوں کو قرار دیتا تھا۔ لہٰذا آئندہ تیاری سے پیشتر وہ اپنے ملک کو ان غداروں سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ ہٹلر کی فتوحات کے ساتھ ساتھ خلافِ صیہونیت تحریک یورپ میں بھی پھیل گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں فلسطین کی یہودی آبادی ۳۰ فی صدی تک پہنچ گئی۔ ۱۹۴۵ء میں ان کی تعداد بچد بن ہزار سے پانچ لاکھ اناسی ہزار ہو گئی۔ عرب قدرتی طور پر متوحش ہوئے۔ انہیں ڈر ہوا کہ اگر فلسطین کے دروازے بدستور کھلے رہے تو یہودی ایک دن اکثریت میں ہو جائیں گے اور ان کا ملک یہودی ملک ہو جائے گا۔ یہودیوں نے سرمایہ کے زور سے غریب عربوں کی

زمینیں خریدنا شروع کردی تھیں۔ وہ اپنی علیحدہ آبادیاں اور بسا رہے تھے۔ ان کی آمد سے عرب بے دخل اور اقتصادی طور پر یہودیوں کے زیرِ اثر ہوتے جا رہے تھے۔ یہودیوں کی پشت پر وہ یہودی سرمایہ دار تھے جو افسانوی دولت کے مالک تھے۔ صیہونیت ایک منظم تحریک تھی۔ اس کے مقابلہ میں عرب غیر منظم اور مفلس تھے۔ لہٰذا ان کے خدشات قدرتی اور حقیقی تھے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہودی مظلوم ہیں اور انہیں آبائی گھروں سے نکالا گیا ہے اس لئے انہیں فلسطین میں آباد ہونے دیا جائے۔ یہ دلیل دینے والے یہ نظر انداز کر جاتے ہیں کہ عرب خود سامی النسل ہیں۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ وہ بھی نام نہاد "اینٹی سامی" تحریک کے علمبردار بن جائیں۔ ہٹلر نے یہودیوں پر جو مظالم کئے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود آریائی نسل سے تھا اور سامیوں کا دشمن تھا۔ یہودی مظلومین کے نام نہاد ہمدردوں اور بہی خواہوں نے جس انداز سے یہودیوں کو فلسطین پر ٹھونسا ہے اس سے "سامی دشمنی" کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ عرب کبھی "سامیوں" (یہودیوں) کے دشمن نہیں تھے۔ وہ اب بھی نہیں۔ انہوں نے بارہا اعلان کیا ہے کہ عرب ممالک میں بسنے والے یہودیوں کو پورے شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ ان پر یہودی ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی۔ فلسطین میں موجود یہودیوں سے اب بھی وہ فراخدلانہ، برادرانہ سلوک کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن جن یہودیوں نے عربوں کے وطن کو خون و آتش کی بازی گاہ بنایا ہے، جن کے ہاتھوں عربوں کے مال و دولت کو نقصان پہنچا، ان کی جانیں ضائع ہوئیں، انہیں عرب کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ ہمدردانِ یہود نے یہودیوں کو "سامی دشمنی" کے یورپی حلقے سے نکال کر عربی حلقے میں جھونک دیا ہے۔ یورپ میں جو آگ خاموش ہو گئی تھی، اسے محبانِ اسرائیل نے عرب میں روشن کر لیا ہے۔ اب یہودی اپنے ہاتھوں جلائی ہوئی اسی آگ میں جل رہے ہیں۔

انتدابِ فلسطین

انتدابِ فلسطین "اے کلاس" تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ فلسطین کی آزادی تسلیم کر لی گئی ہے لیکن جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا، اسے نگرانی میں رکھا جائے گا۔ انگریز کی یہود نوازی عرب آزادی کی منزل کو دور سے دور تر کرتی جا رہی ہے۔ اس کی کیا ضمانت تھی کہ یہ سلسلہ اس وقت رکے گا جب فلسطین یہودی بن چکا ہوگا۔ ان کے ہوتے ہوئے کیا اعرابِ فلسطین آزاد ہو سکیں گے؟ ۱۹۲۷ء میں برطانیہ نے سیلف گورنمنٹ کی طرح ڈالنی چاہی۔ ایک نمائندہ اسمبلی کی تجویز ہوئی جو ہائی کمشنر کی مشاورتی مجلس ہوتی۔ یہودی ہر چند اقلیت میں تھے لیکن ان کے نمائندے برطانوی پارلیمان میں بھی تھے اور برطانوی حکومت میں بھی۔ یہ حقیر سی کوشش بھی یہودی مخالفت کی نذر ہو گئی۔ انگریز نے ببانگِ دہل اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا تھا لیکن اس نے اچانک اسے ترک کر دیا۔ عرب کب تک ضبط کرتے، معاملات دگرگوں ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں فلسطین بھر میں احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے۔ برطانیہ نے تشدد سے اس آزادی کی رو کو دبانا چاہا۔ عربوں کے ہیجان کی

حقیقی وجوہات تھیں، اس لئے حکومت کا جبر و تشدد اسے کچل نہیں سکتا تھا۔ برطانیہ نے پہلو بدلا اور رائل کمیشن قائم کر دیا۔ کمیشن کی تحقیقات کا ماحصل یہ تھا کہ انتداب ناقابل عمل ہے۔ کمیشن نے یہ اضطراری حل پیش کیا کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے اور یہود اور عربوں کو علیحدہ علیحدہ حصے عطا کر دیئے جائیں۔

انتداب کا مقصد فلسطین کو آزادی کے لئے تیار کرنا تھا مگر برطانیہ نے فلسطین کو آزادی کے بجائے تقسیم کے لئے تیار کیا۔ یہ تقسیم کی پہلی تجویز تھی۔ فلسطین کی تقسیم! پنجاب کے بمشکل چار اور سندھ کے کوئی دو اضلاع کے برابر ملک کی تقسیم!!! اور تقسیم کیوں؟ اس لئے کہ یہود کے لئے عرب ملک میں قومی وطن قائم ہو سکے! ابتدا قومی وطن سے ہو گی اور انتہا قومی حکومت پر۔ آخر ان حرکات مذبوحی سے حاصل؟ فلسطین کی مجموعی آبادی بیس لاکھ ہے اور اس کا رقبہ دس ہزار مربع میل۔ کوئی پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ غیر ذی زرع صحرائی ہے۔ اگر یہ سارا علاقہ آبادی کے قابل ہو سکے تو فلسطین کی آبادی دوگنی یعنی چالیس لاکھ —— یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ ہو جائے گی۔ یہ سارے کا سارا قطعہ زمین بھی یہودیوں کے لئے ناکافی ہے۔ دنیا بھر میں یہودی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے۔ اتنا جم غفیر یقیناً اس مختصر سے قطعہ ارض میں نہیں سما سکتا۔ یعنی اگر سارے کا سارا فلسطین یوں یہودیوں کو دے دیا جائے کہ اس میں ایک عرب بھی باقی نہ رہے تو بھی یہودی اس میں نہیں سما سکتے۔ اور جب ایسا ہے کہ ان کی مشکل کا حل فلسطین نہیں ہو سکتا تو سارا زور صرف فلسطین پر صرف کرنے سے فائدہ؟ کیا یہودی ہمدردی کے بہانہ سے عربوں کو کچلا نہیں جا رہا؟ اور پھر اگر بالفرض یہودی سما بھی جائیں تو برطانیہ اور امریکہ ایسا کرنے یا کرانے والے کون؟ انہیں کس آئین یا کس قانون نے یہ حق دیا ہے؟ اگر وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور بنی نوع انسان کے ہمدرد ہیں تو ان کا ادعائے ہمدردی انسان اس وقت کس غار میں جا چھپا تھا جب مشرقی پنجاب، دہلی، مغربی یوپی اور کشمیر کے بے کس اور نہتے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا؟ اس تاریخ میں فقید المثال قتل عام کی زد اتنے انسانوں پر پڑی جو مجموعی طور پر یہودیوں کی دنیا بھر کی آبادی سے بھی زیادہ ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے نہایت تحمّل اور خاموشی سے یہ ہمہ گیر ہلاکت و بربادی کا تماشہ دیکھا۔ خود اقوام متحدہ خاموش رہی اور ہے۔ کم و بیش ساٹھ لاکھ مہاجرین فلاکت زدہ، لٹے لٹائے پاکستان پہنچے۔ کسی کو یہ قیامت دیکھ کر خیال نہ آیا کہ ان مہاجرین کو اپنے ہاں جگہ دے دیں یا دنیا کے کسی اور گوشہ میں ہی آباد کرا دیں۔ مسئلہ کی نوعیت دونوں حالتوں میں ایک ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مسئلہ یہودیوں کی نسبت زیادہ وسیع اور اہم ہے۔

جہادِ حرّیت

انگریز نے ان سب امور کو بالائے طاق رکھا اور یہودی محبت کے جنون میں اپنے مصالح و مفاد کو بھی بھول گیا۔ رائل کمیشن نے جب پہلی مرتبہ تقسیم کا حل پیش کیا تو برطانیہ کے عزائم کا عربوں کو اندازہ ہو گیا۔ جنگ کے دوران کے دلفریب الفاظ، جمعیۃ اقوام

کے بلند بانگ کاغذی اصول، انتداب کا ادعائے آزادی، سب منافقت پر مبنی تھے۔ حقیقت کچھ اور تھی۔ فلسطین میں ہمہ گیر مظاہرے شروع ہو گئے۔ اب کے یہ مظاہرے ان علاقوں میں خصوصیت سے زیادہ تھے جن کے متعلق تجویز تھی کہ انہیں یہودی علاقہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک یعنی آغازِ جنگ عالمگیر ثانی تک فلسطین جنگ سے دوچار رہا۔ ایک طرف مخلص اور مفلس عرب تھا۔ جس نے اپنا سب کچھ انگریز کی خاطر قربان کیا۔ اس فریب میں کہ وہ آزادی حاصل کر سکے گا۔ دوسری طرف انگریز تھا جس نے غلاموں کی آزادی خواہی کو عظیم الشان فریب دے کر انہیں مفت میں خرید لیا تھا۔ سابقہ دوست کا ہاتھ پرانے دوست سے حقِ دوستی کا تقاضا کر رہا تھا۔ اور پرانا دوست، سنگین، توپ، ہوائی جہاز سے اس کے جان و مال سے کھیل رہا تھا۔ اس جہادِ حریت کے قائد مفتی اعظم حسینی تھے۔

ڈاکٹر ماڈ رائڈن نے اپنی کتاب THE PROBLEM OF PALESTINE میں اس جہاد کا مختصر سا نقشہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہے:۔

(انگریز کی طرف سے) تشدد کا جواب تشدد سے دیا جا رہا ہے۔ عرب دیہات پر حملے کئے جاتے ہیں اور حکومت کی فوج انہیں برباد کر دیتی ہے۔ تعزیری کارروائیاں جاری ہیں۔ ان میں ہوائی بمباری، گھروں کو بارود سے اڑا دینا، دیہات کی تباہی، مال و دولت کی بربادی، سب شامل ہیں۔ ملک میں حرکت محدود (اور دشوار) ہو گئی ہے اور کرفیو کا راج ہے۔ مشتبہ افراد کو قیدیوں کے کیمپوں میں بھیج دیا جاتا ہے اور بغیر مقدمہ چلائے محبوس رکھا جاتا ہے۔ دوسروں کو جزائر سیچل میں بغیر مقدمہ چلائے بھیج دیا جاتا ہے۔ کئی جیلوں میں سڑ رہے ہیں اور کئی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔

یہ لرزہ خیز داستان ہے، ان کے لئے ناقابلِ برداشت جو برطانیہ، اس کے مدبرین اور اس کے سپاہیوں کے نام کو عزیز سمجھتے ہیں۔ میں اس پر اس سے زیادہ رائے زنی نہیں کروں گی کہ آئرلینڈ کے زمانہ BLACK اور TANS کے بدترین کوائف کو اس ملک میں دہرایا جا رہا ہے جسے سب عیسائی یہودی اور مسلمان مقدس سمجھتے ہیں جن لوگوں نے اس فلسطین کو دیکھا ہے جس کا میں ذکر کر رہی ہوں، ان کے لئے سرکاری تردیدی بیانات کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ انتہائی تشدد بیکار ثابت ہوا ہے اور اس سے منافرت اور بڑھی ہے۔ بارہا عرب مردوں اور عورتوں نے مجھ سے کہا ہے: اگر برطانوی فوج چوبیس گھنٹے چھٹی لے لے، تو فلسطین میں ایک بھی یہودی زندہ نہ رہے۔ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو طبعاً نرم ہیں اور جو اسی سانس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہودیوں کا مزید داخلہ بند کر دیا جائے تو کل امن ہو سکتا ہے۔

عربوں کے جوش و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ:

ایک صاحب نے، جن کا رنجدہ فریضہ یہ تھا کہ وہ ان قیدیوں سے ملیں جنہیں تشدد کے جرم میں موت کی سزا ملی ہے، مجھ سے بیان کیا کہ انہوں نے ایک مجرم کو دیکھا کہ وہ دوزانو ہو کر اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے اسے ملک اور مذہب کی خاطر جان دینے کی عزت عطا کی۔ ایک عرب (عیسائی) عورت نے مجھے بتایا کہ ایسے بیٹے کی ماں سے جب اس نے اظہارِ تعزیت کیا تو اس ماں نے اس ہمدردی کو فخر و غرور سے رد کر دیا۔ ایک ماں جس کا بیٹا اللہ نے یوں منتخب کیا ہو، قابلِ رحم نہیں، قابلِ عزت ہے۔ (ایضاً)

برطانیہ اپنی طاقت کے زعم میں اپنے جور و استبداد پر قائم رہا۔ بمبار ہوائی جہازوں کے سنانے میں ۱۹۳۸ء میں اس نے وڈ ہیڈ کمیشن WOOD HEAD COMMISION بدیں مقصد فلسطین بھیجا کہ وہ تقسیم کے عملی پہلو سے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ کمیشن کی علتِ تشکیل تقسیم پر رائے زنی نہیں تھی بلکہ تقسیم کی جزئیات طے کرنا تھی۔ کمیشن کی رپورٹ معلومات سے پر ہے۔ اس نے سابقہ تجویز سے کہیں کہیں اختلاف کیا اور نئی تحدید پیش کی۔ رپورٹ کے ایک ایک صفحہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ یہ خاموش اعتراف نمایاں ہے کہ تقسیم ناقابلِ عمل ہے۔ چنانچہ کمیشن نے مجوزہ اجزائے فلسطین کی تحدید کے لئے فوجی قوت کی ضرورت پر زور دیا۔ گویا کمیشن نے یہ تسلیم کر لیا اور حکومت برطانیہ کو بتا دیا کہ تقسیم کے لئے تلوار ناگزیر ہے۔

برطانیہ کی پالیسی میں تبدیلی

۱۹۳۹ء میں برطانوی حکومت نے عرب اور یہودی زعماء کو مذاکرات کے لئے لندن بلایا۔ برطانیہ کا اعتماد عربوں کے دلوں سے اٹھ چکا تھا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۹ء تک کے پچیس سالوں کے انگریزی، عربی تعلقات افسوسناک داستان کے حامل ہیں۔ اتنی بد عہدیوں اور جور و تعدی کے بعد عرب انگلستان کے خلوصِ نیت کے کیسے قائل ہو سکتے تھے؟ انہوں نے پوری جرأت سے کام لیا اور استقامت سے اپنے مطالبات پر اڑے رہے۔ ان کے جذبات کی گہرائی کا اندازہ یہاں سے لگ سکتا ہے کہ انہوں نے یہودیوں کے ساتھ ایک میز کے آس پاس بیٹھ کر مصروفِ گفتگو ہونے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ نے مجبوراً جانبین سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی لیکن کوئی مصالحت کی صورت نہ بن سکی۔ برطانیہ نے بالآخر ۱۹۳۹ء کا مشہور قرطاسِ ابیض شائع کیا جس میں ان کا اپنا حل پیش کیا گیا تھا۔

اس قرطاس کی رُو سے یہودیوں کی آمد پر سے مزید پانچ سال تک کے لئے پابندی ہٹا دی گئی اس شرط کے ساتھ کہ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار سالانہ کی رفتار سے آسکیں گے۔ یعنی وہ کل پچھتر ہزار کی تعداد میں آئیں گے۔ پانچ سال کے بعد مزید آمد عربوں کی رضامندی پر منحصر ہوگی۔ ہائی کمشنر کو یہ بھی ہدایات دی گئیں کہ وہ ایسے قوانین بنائے جن سے یہودی، عربوں کی مملوکہ زرعی زمین آسانی سے نہ خرید سکیں۔ بعض مخصوص علاقوں میں یہ خرید و فروخت حکومت فلسطین کی اجازت سے ہو سکے گی۔ دس سال کے بعد یعنی ۱۹۴۹ء میں فلسطین آزاد ہو جائے گا۔

قرطاس کا مطلب صاف ہے۔ یعنی یہودیوں کی تعداد میں مزید پچھتر ہزار کا اضافہ ہوگا۔ فلسطین دس سال کے بعد آزاد عرب حکومت بن جائے گا۔ یہودی اقلیت میں رہیں گے اور عرب حکومت کے شہری بن کر۔ قرطاسِ ابیض نے تقسیم کو دفن کر دیا اور عربوں کے مطالبات کی صداقت اور بے پناہی کے سامنے برطانیہ کی قوت وشوکت نے ایک حد تک سپر ڈال دی۔ عربوں اور یہودیوں نے اس فیصلہ کو تسلیم نہ کیا۔ اور اسی حال میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی۔ برطانیہ نے اپنی طرف سے زمینوں کی خرید و فروخت اور یہودیوں کے داخلہ سے متعلق "پابندیوں" پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمہ پر یورپی یہودیوں کی آمد کا دباؤ کافی بڑھ چکا تھا۔ صیہونیت فلسطین پر چھا جانے پر مصر تھی۔ قرطاسِ ابیض کی رو سے فلسطین کے دروازے بند ہو چکے تھے اور وہ عربوں کی رضامندی ہی سے کھل سکتے تھے ادھر عرب جو پہلے بکھرے بکھرے تھے نہ محض فلسطین کے مسئلہ پر ہی بلکہ دیگر مشترک امور پر بھی متحد و متفق ہوگئے۔ یہ اتحاد و اتفاق ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ء کو عرب لیگ کی باقاعدہ تشکیل میں ظاہر ہوا۔ عرب لیگ کی تشکیل کے بعد فلسطین کا معاملہ مقامی نہیں رہا بلکہ جملہ عالم عرب کا مشترک مسئلہ بن گیا۔ یہ مسئلہ یوں بھی فلسطین کے مقامی باشندوں کا کب تھا۔ فلسطین عربوں کا ہی نہیں مسلمانانِ عالم کا ہے اور تمام عالم اسلامی اس پر متفق ہے۔

انگلستان میں جنگ کے بعد، حزب عمال برسرِ اقتدار آئی۔ ۱۹۴۵ء کے انتخاباتِ عامہ سے جو نئی پارلیمان مرتب ہوئی اس میں سولہ یہودی ارکان تھے۔ خود عمال حکومت میں ایک وزیر اور دو نائب معتمد یہودی تھے۔ یہودیوں کو اپنے اس اثر و اقتدار کے باعث یقین تھا کہ وہ فلسطین کا فیصلہ حسب منشاء کرا سکیں گے۔ لیکن جب وزیر خارجہ برطانیہ نے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر چکانا چاہا، تو اسے یقین ہوگیا کہ یہ قضیہ اتنا آسان نہیں جتنا یہودی شرکائے اقتدار بتا رہے تھے۔ ایک طرف یہودی دباؤ تھا اور دوسری طرف ممالکِ عربیہ کی لیگ کی متفقہ مخالفت۔ قبل اس کے کہ برطانیہ کوئی اقدام کرتا، خبر مشہور ہوگئی کہ ٹرومین صدر امریکہ برطانیہ سے اپیل کرنا چاہتا ہے کہ کم از کم اور ایک لاکھ یہودی فلسطین میں فی الفور لے لئے جائیں۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک پچھتر ہزار یہودی تو "جائز" طریقے سے آ گئے تھے، لیکن ان کی ناجائز آمد کبھی مکمل طور پر بند نہیں ہوئی تھی۔ اس پر مستزاد ایک لاکھ اور تھے جنہیں صدر امریکہ خواہی نخواہی فلسطین پر ٹھونسنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ ۱۹۴۸ء میں ہونے والا صدارتی انتخاب تھا۔ امریکہ کے پریس اور حکومتی اداروں میں یہود کا بے پناہ اثر و رسوخ تھا۔ انتخابات کے موقع پر مخالف فریق یہودیوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی خوشامدیں کرتے ہیں۔ بقول شخصے، اس موقع پر امریکہ پاگل ہو جاتا ہے۔ ٹرومین کو ڈر تھا کہ اس نے یہ اپیل نہ کی تو اس کی حریف ری پبلکن پارٹی ایسا کر دے گی۔ اس صورت میں یہودی ووٹ ٹرومین کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ محض اپنی انتخابی جیت کے لئے امریکہ کی دونوں پارٹیاں فلسطین کو جہنم میں جھونک دینے پر تیار تھیں۔

ٹرومین کی اپیل کے جواب میں برطانیہ نے امریکہ کو دعوت دی کہ اگر وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرانا چاہتا ہے تو نتائج کی ذمہ داری لے اور یورپ میں یہودیوں کی حالت نیز فلسطین کی صورتِ حال کی پوری تحقیقات کرے۔ ٹرومین نے جھجکتے ہوئے یہ دعوت قبول کر لی۔ اس پر ایک مشترکہ انگلستانی، امریکی کمیشن مرتب ہوا جسے ہدایت دی گئی کہ وہ چار مہینوں کے اندر اندر رپورٹ پیش کر دے۔ کمیشن کی متفقہ سفارشات ظاہر ہے کہ نہ عربوں کو مطمئن کر سکتی تھیں نہ یہودیوں کو لیکن رپورٹ عربی مطالبات کی بے پناہی کا مزید اعتراف تھا۔ بہرحال کمیشن نے ٹرومین کا مطالبہ من و عن تسلیم کر لیا کہ

ایک لاکھ یہودی فوراً فلسطین میں داخل ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ، امریکہ اور دیگر حکومتوں سے درخواست کی گئی کہ وہ بے وطن یہودیوں کے لئے یورپ میں کسی جگہ نئے گھر کی تلاش کریں اور اس ضمن میں فوری اقدام کریں۔ کمیشن نے نہ تو فلسطین کی آزادی کی سفارش کی، نہ عرب حکومت کی، نہ یہودی حکومت کی۔ بلکہ ایسی دو قومی حکومت کا مشورہ دیا جس میں عرب اور یہودی مساوی حقوقِ شہریت کے مالک ہوں۔ مزید رائے یہ تھی کہ فلسطین کو غیر معین عرصہ کے لئے انتداب سے نکال کر تولیت میں رکھ دینا چاہیئے۔ زمینوں کی موجودہ پابندیوں کی تنسیخ کی رائے دیتے ہوئے کمیشن نے ایسی تجاویز پیش کیں جن سے عرب کسانوں وغیرہ کے اس ضمن میں حقوق کی نگہداشت مقصود تھی۔ آخری سفارش یہ تھی کہ جانبین کے تشدّد کو سختی سے دبا دیا جائے۔

ایک دفعہ پھر "ثابت" کر دینے کے علاوہ کہ تقسیمِ فلسطین ناقابلِ عمل اور ناممکن ہے، معاملہ آگے نہ بڑھایا جا سکا۔

فلسطین اقوامِ متحدہ میں

انتداب عملاً برطانیہ کے لئے ایک مہنگا سودا ہو گیا تھا۔ انتدابی عرصے میں برطانیہ کو جان اور مال کا بھاری نقصان اٹھانا پڑا ۔۔۔۔ انگریز اس زیاں سے تنگ آ گیا۔ کیونکہ جنگ نے برطانیہ کے لئے ایسی گوناگوں مشکلات پیدا کر دی تھیں کہ فلسطین اُن کی کمر ہمت توڑ رہا تھا۔ ناچار برطانیہ نے ۲، اپریل ۱۹۴۷ء کو فلسطین کا معاملہ اقوامِ متحدہ کے روبرو پیش کر دیا۔

فلسطین اپنی مخصوص تاریخ کے اعتبار سے ایک قطعہ ارض نہیں رہا۔ جغرافیہ نے اسے کچھ ایسی اہمیت دی ہے کہ تاریخ ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہی۔ سطورِ بالا سے ظاہر ہو گا کہ فلسطین کانٹوں کی سیج پر ہی رہا۔ اسی اہمیّت نے اسے پھر بین الاقوامی استخوانِ نزاع بنا دیا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں ہر چند برطانیہ، امریکہ اور روس متحد تھے، لیکن ان کے باہمی اختلافات کبھی رفع نہ ہو سکے۔ امن ہوا تو جنگ کے یہ اتحادی دو فریقوں میں بٹ گئے۔ جنگ کا جو عظیم الشان بار برطانیہ پر پڑا، اس سے وہ اپنی پہلی عظمت و استقامت بہت حد تک ضائع کر چکا ہے اور اب وہ امریکہ کا دست نگر ہے۔ امریکہ ایک امیر و متمول ملک ہے اور اسے جنگ نے کم سے کم نقصان پہنچایا۔ امریکہ آئندہ جنگی ممکنات کے خوف سے اس حیثیت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ روس بھی اپنے استحکام میں دیوانہ وار مصروف و منہمک ہے۔ مشرقی یورپ اور جنوبی یورپ کا بیشتر حصّہ اس کا ہے۔ مشرقِ وسطےٰ کی اہمیت ظاہر ہے۔ جغرافیائی اہمیت پر مستزاد مشرقِ وسطےٰ کا تیل ہے۔ تیل آئندہ جنگ کی اشد ترین ضرورت ہے۔ ممالک عربیہ کا تیل ایک حد تک برطانیہ اور زیادہ حد تک امریکہ کے قبضہ میں ہے۔ روس کے اپنے تیل کے ذخائر کافی ہیں۔ لیکن وہ تیل کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ ایران میں اسکی دلچسپی اسی ذہنیت کی آئینہ بردار ہے۔ ترکی اور ممالکِ عربیہ میں بھی اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ امریکہ کی اپنی تیل کی پیداوار کافی ہے، لیکن اس کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ ذخائر کے جلدی ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مشرقِ وسطےٰ کا تیل مقابلتاً نو انکشاف۔ وہ کمیت اور کیفیت دونوں میں زیادہ ہے۔ چنانچہ اس تیل نے بین الاقوامی مسابقت پیدا کر دی ہے۔ تیل اور سیاست ایک ہو گئے ہیں۔ مشرقِ وسطےٰ کے ممالک اپنی پسماندگی کے طفیل

چونکہ خود تیل کی پیداوار سے قاصر ہیں، اس لئے یہ نعمت عظمیٰ ان کے لئے وبالِ جان بن گئی ہے۔ روس اور امریکہ کی انتہائی خواہش اور کوشش ہے کہ وہ ان علاقوں پر اپنا تسلّط قائم رکھیں۔ فلسطین کی اہمیت، پھر بڑھ جاتی ہے کہ کرکوک (عراق) سے تیل کی نالی (پائپ لائن) حیفہ (فلسطین) میں منتہی ہوتی ہے۔ حیفہ سے آگے تیل بذریعہ بحری جہاز لے جایا جاتا ہے۔ یہ لائن چھ سو بیس میل لمبی ہے۔ اس سے اس علاقہ کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ فلسطین کا انتداب اور دیگر متبادل تجاویز اسی سیاسی تسلّط کی غماز ہیں۔

بہرکیف فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے روبرو پیش ہوگیا۔ اقوام متحدہ نے ایک خصوصی کمیٹی گیارہ ارکان پر مشتمل متعین کی جو فلسطین میں جاکر حالات و کوائف کا مطالعہ کرے اور اپنی سفارشات پیش کرے۔ کمیٹی مذکورہ نے ڈھائی ماہ کے بعد دو رپورٹیں پیش کیں۔ ایک اکثریت کی جس پر سات ارکان کے دستخط تھے، اور دوسری اقلیت کی جس پر تین ارکان کے دستخط تھے (ایک رکن غیر جانبدار رہا) اکثریت کی رپورٹ نے تقسیم کی تجویز پیش کی اور اقلیت نے ایسے وفاق کی جس کے اجزاء عربی اور یہودی ریاستیں ہوں۔ عربوں نے ان میں سے کسی تجویز کو بھی قبول نہ کیا لیکن یہودیوں نے اکثریت کی رپورٹ کو منظور کرلیا۔ اقلیت کی رپورٹ کو یوں بھی اقوام متحدہ کے حلقوں میں کوئی اہمیت نہ دی گئی اور اقوام، دو صفوں میں بٹ گئیں۔ ایک تقسیم کے حق میں اور دوسری تقسیم کے خلاف یعنی عربی وحدانی حکومت کے حق میں۔ اس پر فلسطین کمیٹی کی دو سب کمیٹیاں بنا دی گئیں جو متعلقہ تجاویز پر پوری طرح غور و خوض کریں۔ اور اپنی سفارشات پیش کریں۔ کمیٹی نمبر(۱) ان ارکان پر مشتمل تھی جو تقسیم کے حامی تھے، دوسری سب کمیٹی وحدانی حکومت کے حامیوں پر مشتمل تھی (اس میں چھ عرب ریاستیں اور افغانستان اور پاکستان تھے) پہلی سب کمیٹی کی صدارت مندوب پولینڈ کے سپرد تھی اور دوسری کی مندوب پاکستان چودھری ظفراللہ خان کے سپرد۔

تقسیم کا فیصلہ

سب کمیٹی ۲ نے اپنی مدلّل و معقول رپورٹ[۵] میں اس امر پر خصوصیت سے زور دیا کہ جمعیتہ اقوام متحدہ تقسیم فلسطین کی مجاز نہیں۔ یوں تو جمعیتہ اقوام کو بھی یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ فلسطین کو برطانیہ کے زیر انتداب کر دے، لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ مجلس عرصہ سے ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے حقوق و اختیارات کسی دوسری مجلس کے نام منتقل نہیں کئے تھے۔ اقوام متحدہ بالکل نیا ادارہ تھا۔ اسے فلسطین کے مستقبل سے متعلق کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا حق و اختیار نہیں تھا۔ چہ جائیکہ وہ تقسیم کا فیصلہ صادر کرتا اور پھر اسے خواہی نخواہی مسلّط کرتا۔ اس کے علاوہ جب انتدابی حکومت نے اعلان کر دیا کہ انتداب ختم کر دیا جائے گا تو فلسطین کو لامحالہ آزاد ہونا چاہیئے۔ برطانیہ نے اپنی روش ایسی کر لی تھی کہ فلسطین اقوام متحدہ کے سپرد رہے۔ وہ جیسا چاہیں فیصلہ کریں، برطانیہ ان کے فیصلہ کا پابند ہوگا لیکن خود کسی قسم کی رائے یا مشورہ

---

۵ پولینڈ کے مندوب یعنی سب کمیٹی ۱ کے صدر نے سب کمیٹی ۲ کے صدر سر ظفراللہ خان کے سامنے اعتراف کیا کہ آپ کی رپورٹ ہماری رپورٹ سے بدرجہا بہتر ہے۔ بقول ظفراللہ خان اس سے اس کا مقصد سفارشات کی تائید نہیں تھا۔ بلکہ معلومات و انداز استدلال کی تعریف تھی۔

نہیں دے گا۔ وہ نہ تقسیم کے حق میں ہے نہ تقسیم کے خلاف۔ وہ اس فیصلہ کی تائید کرے گا جسے عرب اور یہود دونوں تسلیم کریں گے۔ برطانیہ نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ ۱۵ رمئی ۱۹۴۸ء کو انتداب ختم کر دے گا اور فلسطین خالی کر دے گا۔ اختتامِ انتداب تک وہ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرے گا۔ اور امن و امان کا تنہا محافظ ہوگا۔ اس کی فوجیں یکم اگست تک فلسطین سے نکل آئیں گی۔ ۱۵ رمئی کے بعد وہ فلسطین کے لئے ذمہ دار نہیں ہوگا۔ گویا وہ فلسطین کے بعض حصّوں پر قبضہ کرنے کے لئے یہودیوں کا راستہ بالکل ہموار کر دے گا۔

سب کمیٹی نے منشورِ اقوام متحدہ کے پہلے ضابطہ کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی۔ جس میں مذکور ہے کہ اقوامِ متحدہ کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ اقوام کو حق خود اختیاری میسّر آئے اور وہ اپنی حکومت اپنی رضامندی سے طے کریں۔ اس کے مطابق فلسطین کا فیصلہ اہلِ فلسطین کے سپرد ہونا چاہیئے تھا، نہ کہ اقوامِ متحدہ کے سپُرد۔

یہودی تارکینِ وطن کے داخلہ فلسطین سے متعلق کمیٹی مذکورہ نے بتایا کہ چونکہ فلسطین اب تک تین لاکھ یورپی یہودیوں کو پناہ دے چکا ہے، اس لئے اس کے رقبے، ذرائع اور دیگر عناصر کے پیشِ نظر اس داخلہ کو بند کر دینا چاہیئے اور یہودی مسئلہ کو بین الاقوامی خطوط پر طے کرنا چاہیئے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مشورے دیئے گئے۔

۱۔ جن یہودیوں کو اپنے گھروں سے زبردستی نکال دیا گیا ہے (اب چونکہ یورپ میں ان پر وہ ظلم و ستم نہیں ہو رہا، اس لئے) ان میں سے جتنے بھی ممکن ہوں اپنے گھروں میں واپس کر دیئے جائیں۔

۲۔ جو باآسانی اپنے گھروں میں واپس نہیں بھیجے جا سکتے ان کو ارکانِ متحدہ میں ان کی حکومتوں کی آبادی، رقبہ، ذرائع اور گنجائش کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔

۳۔ ایک ایسی کمیٹی مرتب کی جائے جو ہر ملک میں یہودیوں کے بسانے کی تعداد وغیرہ مقرر کرے۔

فلسطین کی آئندہ حکومت وحدانی طرز کی تجویز کی گئی جس میں تمام اقلیتیں شریک ہوں اور ان کے لئے مناسب تحفظات ہوں۔

یہ سفارشات تبصرہ سے مستغنی اور مسئلہ زیرِ نظر کا صحیح حل تھیں۔ لیکن حل کی صحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اقوامِ متحدہ کے پیشِ نظر تو متضاد سیاسی مصالح تھے جن میں تطبیق محال تھی ــــــ لہذا حل ناممکن!

کمیٹی ۱ نے تقسیم کے حق میں سفارش کی۔ رسمی مراحل کے بعد معاملہ ۲۶ر نومبر ۱۹۴۷ء کو جنرل اسمبلی میں مباحثہ کے لئے پیش ہوا۔ تقسیم کا فیصلہ کیسے ہوا؟ یہ دلچسپ داستان ہے اور مختصراً چودھری ظفراللہ خان کی زبانی پیش کرتے ہیں۔

۲۷ر نومبر امریکہ کا تہوار ہوتا ہے۔ یوم تشکّر (THANKS GIVING) کہا جاتا ہے اس لئے ہر رکن حتّٰی کہ صدر تک کی خواہش تھی کہ نشست ۲۶ (بدھ) کی نیم شب تک ختم کر دی جائے۔ اسی اعتبار سے جانبین نے اس دن اپنی ساری قوتیں مرکوز کر لیں۔ تقسیم کے خلاف ۱۶ ووٹ جمع ہو گئے تھے۔

چونکہ ایسے معاملوں کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے تقسیم کے حق میں ۳۲ ووٹ درکار تھے۔ یہ قریباً ناممکن سا نظر آتا تھا۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ ہم نے میدان مار لیا ہے۔ اور تقسیم دفن ہو گئی ہے اس اثناء میں افواہ مشہور ہو گئی کہ سیشن ملتوی ہو جائے گا اور ۲۸ تاریخ یعنی جمعہ کو منعقد ہو گا اور اسی دن ووٹ بھی لئے جائیں گے۔ صدر سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایسا ہی ہو گا۔ اسے بتایا گیا کہ دو دن کے وقفہ سے ہمارے ووٹ ضائع ہو جائیں گے لیکن کسی نامعلوم شخص نے التواء کے لئے کہا اور بالآخر سیشن ملتوی کر دیا گیا۔ یہ قابل ذکر ہے کہ گزشتہ سال یوم تشکر کو اسمبلی کا سیشن منعقد ہوا تھا۔ لیکن اب یہ بہانہ کر دیا گیا کہ اس دن کو چونکہ امریکہ کی تعطیل ہوتی ہے اس لئے سیشن منعقد نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقفہ میں نیویارک کے اخبارات میں خبر آئی کہ یہودی لیڈر ٹرومین سے ملے۔ انہوں نے یہ دھمکی دی کہ اگر تقسیم ناکام ہو گئی تو بحالی یورپ کا بل ناکام کر دیا جائے گا۔ امریکہ کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ٹیلیفون اور تار کے ذریعہ تقسیم کے خلاف کئی مندوبین کی حکومتوں سے مصروف گفتگو ہوا اور انہیں اپنی ہدایات بدل دینے پر مجبور کیا۔ اس پر ہمارے ووٹ ۱۳ رہ گئے۔ ایسے مندوبین نے ہم سے معذرت کرتے ہوئے اس مجبوری کا اظہار کیا کہ ان کی حکومتوں نے حکم دے دیا ہے کہ ووٹ تقسیم کے حق میں دیئے جائیں۔ مثلاً (HAITI) کے ـــــ نمائندہ کی آنکھوں میں آنسو تھے جب اس نے کہا کہ ہم نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہم تقسیم کے خلاف ووٹ دیں گے۔ لیکن ہمیں اس کے حق میں رائے دینے کی ہدایت آگئی ہے۔

مسٹر روزویلٹ نے کہ آنجہانی صدر روزویلٹ کے پوتے ہیں۔ مڈل ایسٹ جرنل کی اشاعت جنوری ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ میں مسئلہ تقسیم کے فیصلے میں صیہونی دباؤ کا یوں ذکر کیا ہے۔

ارکان اقوام متحدہ پر اثر ڈالنے کے لئے (تاکہ وہ جنرل اسمبلی میں تقسیم کے حق میں ووٹ دیں) ٹیلی فونوں، تاروں، خطوں، ملاقاتوں اور سیاسی اور اقتصادی دباؤ کا طوفان امڈا چلا آرہا تھا۔ یہودیوں نے ان اقوام کو جو تقسیم کے خلاف رائے دینا چاہتی تھیں، تقسیم کے حق میں رائے دینے پر مجبور کر دیا یہ سب کچھ اعادہ تھا اس کا جو کچھ نیویارک سٹیٹ کے انتخابات میں ہو چکا تھا۔

یہ کیفیت ہے اس دولت عظمٰی کی جس کے سپرد دوسری عالمگیر جنگ نے اقوام عالم کی قیادت کر دی ہے اور یہ ہے منظر اس ادارہ اقوام متحدہ کا جو اس لئے معرض تشکیل میں آیا کہ کرۂ ارض سے جنگ کو بدر کر دیا جائے۔ اور اقدار انسانیہ کو مستقل حیثیت دے کر امن وامان کو عام اور پائندہ کیا جائے۔ عراقی نمائندہ کے الفاظ میں صدر ٹرومین نے ہی فلسطین کو آگ لگائی ہے اور وہی اسے بجھا سکتا ہے۔ یہ بین الاقوامی ریشہ دوانیاں سیاست دول عظمٰی کا طغرائے امتیاز ہیں اور انہی نے فلسطین کو عقدہ لاینحل بنا رکھا ہے۔

ان حالات میں ۲۹ نومبر کو جنرل اسمبلی نے تقسیم کا فیصلہ صادر کر دیا۔ ۵۷ ووٹوں میں سے ۳۳ تقسیم کے حق میں تھے، ۱۳ مخالف، دس ارکان غیر حاضر رہے۔ رائے شماری کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ امریکہ باوجود ساری ریشہ دوانیوں کے دو تہائی ووٹ حاصل نہیں کر سکا۔ جو ارکان غیر حاضر تھے وہ تقسیم کے خلاف تھے۔

گویا کہا جاسکتا ہے کہ ۳۳ کے مقابلہ میں ۲۳ ووٹ تھے۔ یہ کثرت رائے تو ہے، دو تہائی ووٹ نہیں بہرکیف، یہودی ووٹوں کی خاطر تقسیم کا فیصلہ صادر کرا دیا گیا۔ قبل اس کے کہ امریکہ کی مشکلات کا ذکر کیا جائے، تقسیم کے مالہ، وماعلیہ پر ایک طائرانہ نگاہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔

تقسیم کا خاکہ

اس فیصلہ کے مطابق فلسطین عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یروشلم کو بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا۔ سارے ملک کو ایک مشترکہ اقتصادی بورڈ کے ماتحت کر دیا گیا جس کے ارکان میں سے تین عرب، تین یہودی اور تین اقوام متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے نمائندے تھے۔ ہرچند یہ فیصلہ تقسیم کا تھا لیکن مشترکہ اقتصادی بورڈ رکھ کر ایک مرتبہ پھر عملی اعتراف کیا گیا کہ اس ملک کی تقسیم ناقابلِ عمل ہے۔

یہودی سلطنت تین حصوں پر مشتمل تھی۔ شمال میں مشرقی گیلیلی جس کی سرحدیں شام اور لبنان سے ملتی ہیں۔ وسط میں تل ابیب (TEL AVIV) کی بندرگاہ اور ساحلی میدان، جنوب میں نجف (NEGEV) پہلی تجویز کے مطابق جافا کی بندرگاہ یہودی سلطنت میں شامل تھی۔ اس کے مطابق یہودی حصہ ملک میں پانچ لاکھ نو ہزار سات سو اسی (۵۰۹۷۸۰) عرب تھے۔ اور چار لاکھ ننانوے ہزار بیس (۴۹۹۰۲۰) یہودی۔ گویا یہودی حصہ میں عربوں کی اکثریت تھی۔ اس غیر معقول، غیر منصفانہ تقسیم کے لئے وجۂ جواز یہ پیش کی گئی کہ یہودی، بیرونی یہود کی آمد سے اپنی آبادی جلدی بڑھا لیں گے اور پھر وہ اکثریت میں ہو جائیں گے۔ جافا نکال دینے کے بعد یہودی علاقہ میں چار لاکھ اٹھانوے ہزار (۴۹۸۰۰۰) یہودی اور چار لاکھ پینتیس ہزار (۴۳۵۰۰۰) عرب رہ گئے ــــــ فلسطین کی کل آبادی بیس لاکھ ہے، جس میں سے تیرہ لاکھ عرب ہیں اور چھ لاکھ پچاس ہزار یہودی۔ تقسیم کے حامی یہ دلیل دیتے تھے کہ یہودی آبادی کو عربوں کے ماتحت اقلیت بنے رہنے پر مجبور کرنا ــــــ ناانصافی اور ظلم ہے۔ لیکن یہ دلیل دینے والے عربوں کو بالکل نظر انداز کر رہے تھے۔ اگر یہودیوں کو اقلیت بنانا ظلم تھا تو عربوں کو اقلیت بنا دینا کہاں کا انصاف تھا؟ یہودی کل آبادی کا ۳۳ فی صدی تھے۔ اس کے برعکس یہودی علاقہ میں عرب ۴۶ فی صدی تھے۔ گویا ۳۳ فی صدی کو ۶۷ فی صدی کی حکومت کے تحت اقلیت رکھنا تو ظلم تھا لیکن ۴۶ فی صدی کو ۵۴ فی صدی کے تحت اقلیت بنا دینا ظلم نہیں تھا، عین انصاف تھا۔ مجموعی آبادی کو چھوڑ کر مختلف اجزاء کی علیحدہ آبادی لی جائے تو معاملہ اور مضحکہ انگیز ہو جاتا ہے گیلیلی میں چھیاسی ہزار عربوں کے مقابلہ میں اٹھائیس ہزار یہودی تھے۔ نجفات کی ایک لاکھ دو ہزار کی آبادی میں صرف دو ہزار (پھر سنیئے، صرف دو ہزار) یہودی تھے۔ وسطی علاقہ میں ساٹھ فی صدی یہودی اور ۴۰ فی صدی عرب۔ اگر فلسطین کے انتظامی حصوں کو علیحدہ علیحدہ لیا جائے تو یہودیوں کی حالت اور نحیف ہو جاتی ہے ــــــ فلسطین کے ۱۶ انتظامی حصوں میں سے صرف ایک یعنی حیفہ میں یہودیوں کی اکثریت تھی۔ باقی ہر جگہ وہ اقلیت میں تھے۔ ان کی حکومت کہاں قائم ہو سکتی ہے؟ آبادی کے علاوہ زمین کی ملکیت میں بھی عرب بڑھے ہوئے تھے۔ یہودی علاقہ میں زمین کی نجی ملکیتوں میں عربوں کا ۶۰ فی صدی حصہ تھا اور یہودیوں کا ۷۰ فی صدی۔ اس کے باوجود تقسیم روا رکھی گئی اور یہودیوں کو جو علاقے بخشے گئے وہ زرخیز میدان تھے جنہیں مزید ترقی دی جا سکتی تھی۔ لیکن عربوں کے حصہ میں پہاڑ

علاقے آئے جو ناقابلِ ترقی تھے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ عربوں کو اقتصادی بورڈ کا محتاج بنا دیا جائے اور بتدریج ان کی ترقی مسدود کر دی جائے۔

امریکہ کی مشکلات

تجویز تقسیم کے بعد پانچ ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مرتب کیا گیا تاکہ وہ تقسیم کے نفاذ سے متعلق سفارشات پیش کرے۔ ڈھائی ماہ کے بعد ۱۶ فروری ۱۹۴۸ء کی شب کو اس کمیشن نے رپورٹ شائع کی جس میں اعتراف کیا گیا کہ صورتِ حال انتہائی نازک ہے اور اس کے مزید بگڑنے کا احتمال ہے۔ عربی قوتیں اندرون و بیرون فلسطین، جنرل اسمبلی کے فیصلہ تقسیم کو بزورِ شمشیر بدلنے پر کمربستہ تھے اور یہودی بھی علیٰ ہذا القیاس اپنے مطالبہ پر اڑے ہوئے تھے۔ اختتام انتداب پر مکمل بد امنی پھیلنے کا خطرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ کمیشن نے اس کے مقابلے کے لئے بین الاقوامی پولیس فورس قائم کرنیکا مشورہ دیا۔ مشورہ ایک لحاظ سے نیا نہیں تھا کیونکہ اس کا پہلے سے ہی احساس پایا جاتا تھا۔ لیکن امریکہ اس زعم میں تھا کہ وہ محض رعب سے عربی حکومتوں کو خاموش کرا دے گا اور اس کے لئے قوت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ عرب روز بروز اپنے مطالبات میں متشدد ہوتے جا رہے تھے۔ فلسطین کی مجلس اعلیٰ نے فلسطین کمیشن کو بتایا کہ عرب یہودی ریاست کی تشکیل کی ہر کوشش کو اقدامِ جنگ سمجھیں گے اور اس کا پورا مقابلہ کریں گے۔ عرب لیگ کے جنرل سیکرٹری عزام پاشا نے ۱۷ فروری کو اعلان کیا کہ اگر تقسیم کو قوت کے بل بوتے پر مسلط کیا گیا تو باقاعدہ عربی فوجیں تقسیم کا مقابلہ کریں گی۔ عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مارچ کے اوائل میں نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار متعینہ قاہرہ نے یہ خبر بھیجی کہ عرب لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ امریکی کمپنیوں کو اجازت نہیں دے گی کہ وہ ارکان عرب لیگ کی مملکتوں کی حدود میں پائپ لائنیں بچھائیں۔ شام سے متعلق خبر آئی کہ اس نے امریکی کمپنی کے اس اجارہ کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا ہے جو چھ ماہ پیشتر طے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دلچسپی سے خالی نہ تھی کہ مصر بھی عرب لیگ کے فیصلہ کا پابند ہو گا۔ اور حجاز بھی غالباً موجود کمپنیوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرے گا۔ حالات نے امریکہ کو یقین دلا دیا کہ عرب گیدڑ بھبکیاں نہیں دے رہے بلکہ وہ واقعی ایسے عزائم رکھتے ہیں۔ فلسطین کمیشن نے عربوں کے عزم غیر متزلزل کی تصدیق کی تو امریکہ کی آنکھیں کھلیں۔ ٹرومین نے محسوس کیا کہ وہ یہودی ووٹوں پر عربوں کو آسانی سے قربان نہیں کر سکتا۔

فلسطین میں بین الاقوامی پولیس کے مسئلہ نے اور مصیبت پیدا کر دی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو امریکہ نے تقسیم کا فیصلہ منظور کرایا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک کے پانچ مہینوں میں بین الاقوامی صورت حال اور نازک ہو گئی تھی۔ چیکوسلواکیہ میں دیکھتے دیکھتے اشتراکی حکومت مسلط ہو گئی تھی۔ خرس روس کا سایہ فن لینڈ پر پڑ رہا تھا۔ امریکہ روس کے مقابلہ کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس کی نگاہ شمال میں ناروے پر تھی اور جنوب میں اٹلی پر۔ اٹلی میں انتخابات ہونے والے تھے۔ پانچ مغربی قوتیں ——— برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ کے مابین پچاس سال کا عسکری امداد کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ جسے امریکہ کی "مارشل امداد" کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ خود ٹرومین ایک حد تک جبری عسکری تربیت کی اپیل کر چکا تھا۔ ایسے نازک مرحلے پر امریکہ

فلسطین میں بدامنی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بین الاقوامی فوجی مداخلت کا سوال بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اقوامِ متحدہ کے پاس منشور کی رُو سے کوئی ایسی عسکری تنظیم نہیں تھی۔ اور اگر قومیں انفرادی طور پر فوجیں مہیا کرتیں تو روسی فوجیں ضرور فلسطین آپہنچتیں۔ امریکہ کسی حال میں بھی روسی فوجوں کو فلسطین میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ان گوناگوں مصائب میں مبتلا اور متضاد صورتوں سے دوچار ہو کر امریکہ نے رجعت کی اور ۱۹ مارچ کو اچانک یہ اعلان کر دیا کہ وہ اب تقسیم کا مؤید نہیں رہا۔ اس کے خیال میں فلسطین کو عارضی طور پر تولیت (TRUSTEE-SHIP) میں دے دیا جائے۔ نفاذِ تقسیم میں جو خطرات و مہالک تھے اور جو سب کو صاف نظر آرہے تھے، امریکہ نے ان کا انکار کیا، لیکن بالآخر اُسے بہت جلد ان کی بے پناہی کے آگے جھکنا پڑا۔ اس رجعت نے نہ محض اس کے اپنے وقار کو صدمہ پہنچایا، بلکہ اقوامِ متحدہ کے ادارہ کو ایک بیکار اور کھوکھلا ادارہ ثابت کر دیا۔ فلسطین اقوامِ متحدہ کی آزمائش تھا۔ لیکن وہ اس میں پوری نہیں اتریں۔ اس جمعیۃ نے پورے تیرہ مہینے فلسطین کے معاملہ پر بحث و تمحیص کی لیکن ناکام رہی۔

نئی صلیبی جنگ

امریکہ نے عارضی تولیت کی جو تجویز پیش کی وہ بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اسی لیت و لعل، گومگو اور تذبذب میں ۱۵ مئی کی فیصلہ کن تاریخ آپہنچی۔ برطانیہ فلسطین کو خالی کر کے رخصت ہو گیا۔ یہودیوں نے اسرائیلی سلطنت قائم کر لی اور فلسطین ایک اور صلیبی جنگ کا میدان بن گیا۔ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں دوسری صلیبی جنگ میں شکست کھانے کے بعد صلیبی آج تک خطرے کا باعث نہیں بن سکے تھے۔ آلِ اسرائیل جو ایک دفعہ الٰہی انعام و فضائل سے محروم ہو کر تین ہزار سال سے لعنت و ذلّت و مسکنت کی وادیوں میں سرگرداں چلی آرہی تھی، اپنی ساری شیطنت کاریوں کے ساتھ بیت المقدس کی گلیوں میں تہذیب و انسانیت کو ذلیل و رسوا کرنے لگی۔ یہودی، تابوتِ سکینت کے، طالوت کے عہد میں بھی مستحق نہیں تھے۔ اور وہ انہیں بطور انعامِ خداوندی عطا ہوا تھا۔ تاکہ انہیں "ظالمین" کے بجائے "صابرین" اور "مومنین" بننے کا ایک اور موقع دیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آلِ اسرائیل فطرت کی مہلت بخشیوں سے کبھی استفادہ نہیں کر سکی۔ وہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ چالیس سال صحراؤں میں آوارہ نہیں رہی بلکہ تاریخ کے سارے دور میں وہ صحرا سے نکل کر کسی "مصر" میں داخل نہیں ہو سکی۔ آج وہ سود در سود، اور چور بازار کے ذریعہ کمائے ہوئے سرمایہ سے حاصل کردہ قوت اور اسلحہ سے وہی "تابوتِ سکینت" حاصل کرنے پر مضطرب ہیں جو قوت اور سرمایہ سے نہیں بلکہ قانونِ مشیتِ ایزدی کے تحت ملتا ہے لیکن جو قوم فیضانِ سماوی سے محروم ہو جاتی ہے اس کے عمل و کمالات کی حد یہی فساد و طغیان ہوتے ہیں۔

یہودیوں نے ۱۵ مئی کے بعد فلسطین میں "اسرائیلی حکومت" کا اعلان کر دیا۔ اس کا مرکز تل ابیب ہے۔ اس حکومت کی حیثیت کیا تھی اور اس کی سرحدیں کونسی؟ یہ خود یہودی بھی نہیں جانتے تھے۔ لیکن بین الاقوامی سیاست کی طفلانہ حرکتوں نے اس حکومت کو کاغذی نہیں رہنے دیا۔ اسی سال امریکہ کا صدارتی انتخاب ہو رہا تھا۔ صدر ٹرومین گزشتہ انتخاب کے موقع پر نائب صدر منتخب ہوا تھا، لیکن روزویلٹ کی موت پر آئین کے مطابق صدر بن بیٹھا تھا۔ وہ اس منصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ڈیموکریٹک پارٹی جس کا وہ نمائندہ تھا، گزشتہ سولہ سال سے برسرِ اقتدار چلی آرہی تھی۔ بعض حلقوں میں اسی وجہ کو اس پارٹی کی شکست کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ٹرومین

ہر وہ حرکت کرنے کے لئے تیار تھا جو اُسے صدر بنائے رکھنے میں مفید ہوتی ۔ یہودی اہم مہرہ تھے ۔ چنانچہ ادھر یہودیوں نے نئے بنیاد اسرائیلی حکومت کا اعلان کر دیا ۔ ادھر صدر ٹرومین نے اسے تسلیم کر لیا ۔ شکاگو ٹربیون نے اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۸ مئی کی اشاعت میں لکھا ۔

ڈپلومیٹک عجلت میں ٹرومین نے ریکارڈ قائم کر دیا ہے ۔ (اسرائیلی حکومت تسلیم کرنے میں) ٹرومین نے آدھ گھنٹہ کا بھی انتظار نہیں کیا ۔ حکومت کو تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن کوئی بھی نہیں جانتا کہ حکومت کیا ہے اور اس کی حدود کون سی ہیں ۔ ٹرومین نے یہ کچھ جاننے کا انتظار نہیں کیا ۔ اس کی نظر یہودی ووٹوں پر تھی ۔ یہی اس کی عجلت کی علت ہے ۔

شرق اردن کے وزیر خارجہ نے کہا کہ شرق اردن کی اقوام متحدہ کی رکنیت کی درخواست پر حفاظتی کونسل نے کئی مرتبہ سفارش کرنے سے انکار کر دیا ہے ۔ لیکن امریکہ نے یہودی حکومت کو بلا وجہ فوراً تسلیم کر لیا ہے ۔

امریکہ کے اقدامات میں شریک ہونے کے لئے روس نے بھی اسرائیلی حکومت کو تسلیم کر لیا ۔ امریکہ کے لئے یہ اور مصیبت پیدا ہو گئی ۔ اس نے روس ہی کے ڈر سے تو تقسیم کا فوجی قوت سے نفاذ نہیں کیا تھا ۔ روس پھر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا ۔

جن حالات میں "اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا ۔ ان پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ حقیقت روز روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ یہ نتیجہ ہے منظم بین الاقوامی سازش کا ، یہ دراصل میوۂ تلخ ہے اس تخم خبیث کا جسے عیسائیت اپنی روح کی گہرائیوں میں بوتی چلی آئی ۔ صلیبی جنگوں میں اسی کی فصل پک کر تیار ہوئی تھی ۔ اور ہلال اسلام کی درانتی سے خوب خوب کٹی تھی ۔ یورپ کی تہذیب جدید نے اس فصل کی از سر نو آبیاری کی ۔ انگریز اس ذہنیت کا زندہ مجسمہ تھا ۔ چنانچہ اس کی پوری استعماری تاریخ اس نکتہ کی تفسیر ہے ۔ اس برصغیر میں مسلمانوں کو اس نے حرف غلط کی طرح مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا ۔ سلب و نہب سے بے دست و پا بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس نے برہمن سے ملی بھگت کی اور اس مہرے سے انہیں شہ مات دینے میں مصروف و منہمک رہا ۔ جب اسے آخر کار برصغیر کو یوں آزاد کرنا پڑا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہو گیا ، تو اس نے افراتفری مچا دی ۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ پاکستان پہلے دن سے ہی یوں ہندو کے رحم و کرم پر ہو جائے ، کہ اس کا ہونا ، نہ ہونا برابر ہو ۔ اس پر بھی وہ اقوام عالم کی صف میں بیٹھ کر پوری ڈھٹائی سے کہتا چلا آرہا ہے کہ اس نے خوش دلی سے برصغیر کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا ۔

اس "خوش دلی" کا مظاہرہ فلسطین میں بھی ہوا ۔ یہودی ترک وطن کے برساتی نالوں کا رخ موڑ موڑ کر اس نے یہودی آبادی کو عربوں کے برابر کر دیا اور اسے ایک حکومت کی طرح مسلح ہونے کے مواقع مہیا کئے ۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ یہودی قزاق ہر طرح تیار ہیں تو از خود اپنے انخلاء کی ایک تاریخ مقرر کر کے فلسطین چھوڑ کے چلا گیا ۔ اس نے اختیارات منتقل کرنے کی معروف صورت اختیار نہیں کی ۔ اُسے چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومت مقامی نمائندوں کو سونپ دیتا اور اگر کسی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ تھا تو اقوام متحدہ سے درخواست کرتا کہ وہ کوئی مناسب متبادل انتظام کر دے ، یعنی خود اس انتظام کو سنبھال لے ۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور عربوں اور یہودیوں کی

جنگ کے باوجود فلسطین کو چھوڑ دیا۔ اسرائیل کو معرضِ وجود میں لانے کی یہی واحد اور یقینی صورت تھی۔ یہودیوں اور عربوں کو لڑتا چھوڑ کر آجانے کے بعد اس نے اقوامِ متحدہ سے درخواست کی کہ وہ معاملہ کو ہاتھ میں لے۔ اقوامِ متحدہ میں سازش کار شتہ امریکہ نے سنبھال لیا اور اس نے اسرائیل کی غاصب حکومت پر عالمی مہرِ تصدیق مثبت کرا دی اور اس کا راستہ بھی ہموار کر دیا کہ اقوامِ متحدہ نے اپنی تجویزِ تقسیم میں جتنے علاقے یہودیوں کے لیئے تجویز کیئے تھے۔ وہ ان سے کہیں زیادہ ہتھیا کر بیٹھ جائیں۔ فلسطین کا مسئلہ انیس سال سے اقوامِ متحدہ کے روبرو پیش رہے۔ لیکن وہ اس رکن ملک کو اس حد تک مجبور کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی کہ وہ انہیں علاقوں پر قناعت کرنے پر راضی ہو جائے جو اقوامِ متحدہ نے اپنے طور پر انہیں دینا چاہے تھے۔ اس کی وجہ سے گو عربوں کا موقف اقوامِ متحدہ کے باہر یہی ہے کہ غاصب حکومت اسرائیل کو ختم ہونا چاہیئے، لیکن اقوامِ متحدہ کے اندر وہ یہی مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں کہ اسرائیل کو ان حدود تک محدود کرنے پر مجبور کیا جائے جو اس کے لیئے اقوامِ متحدہ نے متعین کی تھیں۔

انگریز نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق فلسطین چھوڑ دیا تو فلسطین میں باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ یہ جنگ عربوں اور یہودیوں کے درمیان بھی تھی اور عربوں اور عربوں کے درمیان بھی۔ عربوں کے باہمی تعلقات کا یہ عالم تھا کہ وہ یہودیوں کے خلاف لڑتے لڑتے بھی آپس میں لڑنے سے باز نہ آئے اور لڑے بھی وہ فلسطین ہی کے محاذ پر۔ بلکہ ان کی نگاہ یہودی دشمن پر کم اور عرب ہمسائے پر زیادہ تھی۔ یعنی ان کی کوشش زیادہ تر یہ نہیں تھی کہ یہودیوں کا راستہ روکا جائے۔ بلکہ یہ کہ ان کا دوسرا عرب بھائی فلسطین کا کوئی حصّہ یہودیوں سے چھین کر اپنے تصرف میں نہ لے لے۔ انہیں ڈر یہ تھا کہ جس کسی نے بھی فلسطین کا کچھ حصّہ آزاد کرا لیا وہ اسی کی تحویل میں چلا جائے گا۔ اور پھر اس کی سلطنت کی حدود اسی تناسب سے وسیع ہو جائیں گی۔ وہ یہ گوارا نہیں کرتے تھے، کہ کوئی عرب ملک ان کے مقابلے میں اس طرح پہلے سے زیادہ وسیع اور مضبوط ہو جائے۔ اس قسم کا تصادمِ اغراض مصر اور اُردن (جو اُن دنوں شرق اُردن کہلاتا تھا) کے درمیان خصوصیت سے زیادہ تھا۔ اتفاق سے عربوں میں (شرق) اُردن ہی ایک ایسا ملک تھا جس کے پاس منظم اور جنگجو فوج تھی۔ چنانچہ گو مصر نے فلسطین کے جنوبی صحرا کے کچھ حصّوں پر قبضہ کر لیا، اُردن نے دریائے اُردن کے مغرب کا اچھا خاصا علاقہ آزاد کرا لیا اور مسلمانوں کے متعدد مقاماتِ مقدسہ، حتّٰی کہ یروشلم کے پُرانے حصّے کو بھی یہودیوں کی دستبرد سے بچا لیا، اس بنا پر وہ شرق اُردن سے اُردن بن گیا۔ لیکن اس طرح ایک ایسی استخوانِ نزاع پیدا ہوگئی کہ عرب آج تک فلسطین کے بارے میں کوئی مشترک لائحہ عمل نہیں بنا سکے۔ اس کا افسوسناک مظاہرہ ابھی حال ہی میں ہُوا جب کہ اسرائیل نے اُردن کے خلاف جارحیت کا ثبوت دیا۔ اُن دنوں قاہرہ سے باقاعدہ پروپیگنڈا ہوتا تھا، کہ اردن کی حکومت کو دست بردار ہو جانا چاہیئے۔ گویا فوری مسئلہ اسرائیل کی جارحیت نہیں تھا، شاہ حسین کی معزولی تھا۔

اُردن کا ردِّ عمل اسرائیل کے خلاف بالعموم قابلِ تعریف رہا۔ شاہ حسین اس ناخواندہ اور غاصب مملکت کے اس حد تک خلاف ہیں کہ اُنہوں نے ایک شاہی مجلس اس مقصد کے لئے قائم کر رکھی ہے کہ اُردن پر جارحانہ

حملہ ہوا تو وہ خود لڑنے کے لئے محاذ پر پہنچیں گے اور اگر وہ ناکام آ گئے تو یہ مجلس کاروبارِ حکومت سنبھال لے گی انہوں نے ان فلسطینیوں کو بھی حقوقِ شہریت دے دیئے جو اُن کے مُلک میں آ گئے ہیں۔ لیکن اس سے اصل مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور اُلجھا ہے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ الجھا دیا گیا ہے۔ یہودیوں نے جن علاقوں پر تسلّط جمایا ہے، ان میں سے مسلمانوں کو نکال دیا گیا ہے۔ ان مظلومین کو عربوں نے اپنے ہاں ابھی تک آباد نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آباد ہو کر عرب ممالک میں جذب ہو گئے تو فلسطین کو بھول جائیں گے۔ اور اس طرح تحریکِ استخلاصِ فلسطین کو نقصان پہنچے گا۔ اس موقف کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما ہے کہ اگر فلسطینیوں کو متعلقہ ممالک میں آباد ہونے دیا گیا تو دریائے اُردن کے مغرب میں جو فلسطینی اردن کے حصّے میں آئے ہیں، انہیں اور انکے علاقے کو اُردن کا حصّہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس سے بچنے کے لئے فلسطینی مظلومین کو اپنا شہری تسلیم نہیں کیا گیا۔ چنانچہ صورت یہ ہے کہ اس وقت کم و بیش تیرہ لاکھ مہاجرین کیمپوں میں گل سڑ رہے ہیں جو قائم تو مختلف عرب ممالک میں ہیں لیکن ان کا انتظام اقوامِ متحدہ کے ایک ادارے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ادارہ بامرِ مجبوری یہ انتظام سنبھالے ہوئے ہے اور مہاجرین بڑی کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ زندگی کی آسائشوں سے وہ بالعموم محروم ہیں اور نہ گھر کے ہیں اور نہ گھاٹ کے۔ عرب ممالک بہرحال اقوامِ متحدہ پر کڑی نکتہ چینی تو کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان بے گھر فلسطینیوں کے لئے مناسب انتظام نہیں کرتی لیکن وہ خود انہیں اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے، نہ ان کے مصائب کے ازالے کے لئے کوئی اقدامات ہی کرتے ہیں۔ اہلِ فلسطین ۱۹۴۸ء میں اپنے گھروں سے نکالے گئے تھے۔ اب تک (یعنی ۱۹۶۷ء تک) ایک نئی نسل کیمپوں میں پیدا ہو کر جوان ہو چکی ہے۔ اس پوری نسل کا کیا ہو گا؟ اور بات ایک نسل کی نہیں، دوسری نسل ان کے پہلو بہ پہلو تیار ہو رہی ہے۔ ان کا کیا بنے گا؟ کون ذمہ دار ہے اس کا؟ یہ نسلیں کس گناہ کی پاداش میں "قتل" ہو رہی ہیں؟ ہر گزرنے والا سال عربوں سے یہ سوال پوچھتا ہے ——— اور ان کا دامن جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن عرب ایک دوسرے کا دامن کھینچ کھینچ کر انہیں تار تار کرنے سے ہنوز فارغ نہیں ہو سکے اور نہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں تشتّت و افتراق کی رَو کو روک سکیں گے۔

فلسطین کے مسئلہ پر عرب سربراہ بھی کئی بار مل بیٹھے ہیں اور عرب لیگ کے نمائندوں نے بھی بارہا سر جوڑے ہیں۔ اُنھوں نے مشترکہ دفاع تک کا منصوبہ تیار کیا ہے لیکن کوئی عملی کام نہیں ہو سکا کیونکہ یہی طے نہیں ہو پاتا کہ فلسطین کو آزاد کیسے کرایا جائے۔ اس تجویز کو قبول نہیں کیا گیا کہ عرب ممالک مشترکہ جد و جہد کریں۔ حالانکہ مل جُل کر ہی یہودیوں کے خلاف مؤثر محاذ قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ تجویز بار بار پیش کی جاتی ہے کہ فلسطینیوں کو منظم کر کے انہیں یہودیوں کے خلاف لڑنے دیا جائے اور پھر ان کی امداد کی جائے۔ گویا جس طرح الجزائری مجاہد فرانس کے خلاف لڑے، اسی طرح فلسطینی یہودیوں کے خلاف لڑیں۔ یہ درست، لیکن اس تجویز کا محرک جذبہ یہ ہے کہ اس طرح فلسطین کا جو حصّہ اُردن کے پاس ہے وہ اُردن سے "آزاد" ہو جائے گا اور اُردن، شرق اردن بن کے رہ جائے گا۔ اسی جذبہ کے تحت حال ہی میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ مصر کی فوجیں بھی اُردن میں متعین کی جائیں تاکہ وہ یہودیوں کے خلاف لڑ سکیں۔ اس کا جواب بجا طور پر، اُردن نے یہ دیا کہ اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لئے اوّل تو ہر ملک کی

فوجیں ان سرحدوں پر موجود ہونی چاہئیں جو اسرائیل سے ملتی ہیں، دوسرے مصر کو اسرائیل ہی کے مقابلے کا خیال ہے تو وہ اپنی فوجیں یمن سے کیوں واپس بلا نہیں لیتا۔ واضح رہے کہ مصر کی چالیس ہزار سے زائد فوج کئی سالوں سے یمن میں مقیم ہے اور معزول امام یمن اور شاہ سعود کے خلاف برسرپیکار ہے۔ یہ فوج اسرائیل کے خلاف کام میں لائی جا سکتی ہے اور لائی جانی چاہیئے۔ لیکن عربوں کی باہمی رقابتوں کا یہ عالم ہے کہ ان کی قوت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ہی ضائع ہو رہی ہے۔

اسرائیل کی زبانی مخالفت اور باہمی خانہ جنگی کا سنگین نتیجہ ۱۹۵۶ء میں نکلا جب اسرائیل، فرانس اور برطانیہ نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا۔ مصر ان میں سے کسی ایک طاقت کا بھی مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن روس کی مداخلت اور روس اور امریکہ کی مسابقت کے طفیل اس کھلی جارحیت کو روک دیا گیا۔ اور اقوامِ متحدہ نے مصر اور اسرائیل کی سرحد پر بین الاقوامی فوج متعین کر دی۔ اس جارحیت کا ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ مصر نے نہر سویز کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس آبی شاہ راہ پر بین الاقوامی تسلط ختم ہو گیا۔ اس طرح ان سازشوں کا سلسلہ ختم ہو گیا، جو اس تسلط کے طفیل ہوتی رہتی تھیں۔ یہ پہلو بڑا خوش آئند ہے لیکن اصل مسئلہ جوں کا توں ہے۔ نہر سویز پر قبضہ کر لینے سے اسرائیل کی ناکہ بندی نسبتاً اور مضبوط ہو گئی لیکن محض اس طرح کی ناکہ بندی فیصلہ کن ثابت نہیں ہو سکتی۔ بین الاقوامی سیاست کا یہ عملی سبق بالکل نہیں بھولنا چاہیئے کہ کسی ملک کی ناکہ بندی کبھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ پر حملہ کیا تھا۔ تو اس وقت اقوامِ عالم نے اس کی ناکہ بندی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جنوبی افریقہ کی ناکہ بندی کب سے ہو رہی ہے۔ رہوڈیشیا کی ناکہ بندی کا بھی فیصلہ ہو چکا ہے ناکہ بندی کے یہ فیصلے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھے کیونکہ بہت سی قومیں ان کی مؤید تھیں۔ اگر وہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکے تو عربوں کی طرف سے اسرائیل کی محدود ناکہ بندی نمایاں طور پر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ناکہ بندی نہ کی جائے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تنہا ناکہ بندی کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ امریکہ اس ناکہ بندی میں نہ محض شریک نہیں، وہ اسکے برخلاف ہے۔ چنانچہ عرب ایک راستہ بند کرتے ہیں تو امریکہ کے ہاتھوں کئی در کھل جاتے ہیں اور یہ در مسلسل کھل رہے ہیں۔ یہ سب کچھ عرب بھی جانتے ہیں اور دنیا ساری بھی جانتی ہے۔

اسرائیل بہت بڑا خطرہ ہے۔ مزید خطرہ یہ ہے کہ اس کی سنگینی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے ———— کبھی سارے فلسطین میں یہودیوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ اب صرف مقبوضہ فلسطین میں ان کی تعداد بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ یہ تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہودی مسلسل اسرائیل میں درآمد کیے جا رہے ہیں۔ اسرائیل کے جارحانہ عزائم اپنی جگہ، محض بڑھتی ہوئی آبادی کے زور پر ایک نہ ایک دن اسرائیل کو مزید علاقے کی ضرورت ہو گی۔ اس کے لئے توسیع ناگزیر ہوتی جا رہی ہے۔ گویا یہودی "مجبور" ہوتے جا رہے ہیں کہ وہ مزید عربی علاقے ہتھیائیں۔ یہ علاقے انہیں عربوں سے فتح کرنے ہوں گے۔ وہ اس کے لئے شبانہ روز کوشش کر رہے ہیں۔ وہ خطرناک جنگی تیاریاں بھی کر رہے ہیں اور زیادہ سے زیادہ آبادی کے لئے جگہ پیدا کرنے کے لئے صحراؤں کو آباد کاری کے قابل بھی بنا رہے ہیں۔ جہاں تک جنگی تیاریوں کا تعلق ہے، اسرائیل، امریکہ کی شہ پر اور مدد سے، ایٹمی طاقت بننے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ اس چور دروازے سے بھارت کو بھی مدد دی جا رہی ہے۔ عرب اسے جانتے ہوئے بھی بھارت کو دوست سمجھے جا رہے ہیں۔ جہاں تک یہودی آباد کاری کا تعلق ہے، اس سے عربوں کے لئے بالعموم اور اردن کے لئے بالخصوص ایک نیا فتنہ،

پیدا ہو گیا ہے۔ اسرائیل یہ منصوبہ روبہ عمل لا رہا ہے کہ جھیل گلیلی کا پانی نکال کر اپنے صحراؤں کو مزید یہودیوں کے لیے قابلِ رہائش بنائے۔ اس منصوبے کا مطلب یہ ہے کہ دریائے اردن جس پر اردن کی معیشت کا دار و مدار ہے، خشک ہو جائے اور یہ ملک صحرا بن جائے۔ اُردن کے کہنے پر عربوں نے اس کا جواب یہ سوچا ہے کہ جو دریا جھیل گلیلی میں آ کر گرتے ہیں، ان کا رُخ اُوپر سے ہی موڑ دیا جائے۔ اسرائیلی منصوبے کا یہ ایک حد تک جواب تو ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عرب ایسا کر گزریں گے؟ اسرائیل نے فیصلہ ہی نہیں کیا، وہ تو عمل بھی کر رہا ہے۔ عرب باتیں ہی کئے جا رہے ہیں۔ وہ اگر باتیں ہی کرتے تو توقع ہو سکتی تھی کہ آگے چل کر عمل کا مرحلہ بھی آ جائے گا۔ لیکن وہ باتیں کرتے کرتے آپس میں اُلجھ جاتے ہیں۔ اور اسرائیل کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ یہ اُس مسلسل جارحیت کا جواب نہیں جو برطانیہ اور امریکہ کی ملی بھگت سے اسرائیل کی شکل میں عربوں کے خلاف روا رکھی گئی۔ اور جو کسی وقت بھی عربوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن عرب شاید یہ تو سمجھ گئے ہیں کہ ع

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں

لیکن یہ راز جانے وہ کب پائیں گے

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات

خودی کی تربیت و لذتِ نمود میں ہے!

فلسطین کے مرضِ کہن کا چارہ اس کے سوا کچھ نہیں۔